علامہ اقبال اور افغانستان

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر
(سابق صدر، شعبۂ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی)

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملتِ افغان در آن پیکر دل است
از فسادِ او فسادِ آسیا
در کشادِ او کشادِ آسیا
(جاوید نامہ)

قرطاس
۲۰۱۸ء
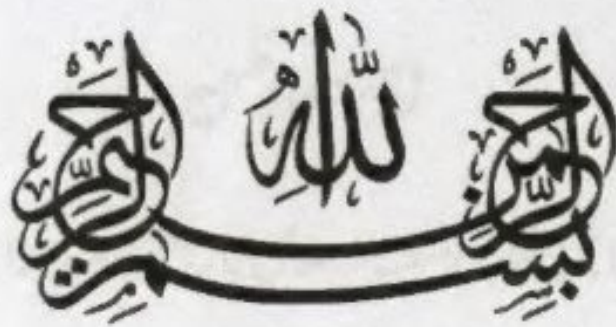
يَلُوحُ الْخَطُّ فِى الْقِرطَاسِ دهراً

وكاتبهٗ رَمِيمٌ فِى التُّرابِ

[نقشِ کتابت، کاغذ پر مدتوں قائم و دائم اور تاباں رہے گا

جبکہ لکھنے والے کی ہڈیاں خاک میں مل چکی ہوں گی]

علامہ اقبال اور افغانستان

نگار سجاد ظہیر

(سابق صدر، شعبہ اسلامی تاریخ جامعہ کراچی)

قرطاس

۲۰۱۸ء

انتساب

اپنے پوتے

امیر خطاب (بن سعود ظہیر)

کے نام

جو علامہ اقبال کی نظمیں لہک لہک کے پڑھتا ہے۔

فہرست مضامین

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ ، زندہ شو

(اپنی تاریخ کو محفوظ کر کے بقائے دوام حاصل کرو
گزرے ہوئے زمانے سے بھی زندگی مل سکتی ہے۔)

ابتدائیہ

اردو ادب میں علامہ اقبال پر مختلف جہتوں سے بہت کچھ لکھا گیا ہے، اب جبکہ نہ فکرِ اقبال کوئی سربستہ راز ہے اور نہ ہی اقبال کی شخصیت دھندلکوں میں پوشیدہ، سب کچھ روشن اور میسّر ہے تو پھر آخر اقبال کی شخصیت پر مزید کیوں لکھا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس تیزی سے ہماری نوجوان نسل اقبال اور فکرِ اقبال سے دور ہوتی جارہی ہے، اس کے پیشِ نظر اس بات کی ضرورت ہمیشہ رہے گی کہ اقبال کی شخصیت وفن اور خاص طور سے ان کی فکر پر پاکستانی نوجوانوں کے لیے نہ صرف لکھا جائے بلکہ مسلسل لکھا جائے۔

ایک فلسفی، مفکر اور شاعر کے طور پر اقبال دنیا بھر کے لیے جو ہیں، وہ ہیں لیکن اہلِ پاکستان کے لیے اقبال "شخصِ دیگر" ہیں۔ ان کی شاعری، پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع ہے، اور پاکستانی نوجوانوں کو اپنے دفاع کے لیے تیار رہنا چاہیے، لہٰذا صرف یہی ضروری نہیں کہ اسکول اور کالجوں کے نصاب میں اقبال کو جگہ دی جائے بلکہ بہ اندازِ دگر بھی اقبال کے شاہین بچوں کو غمِ اقبال، عشقِ اقبال اور فکرِ اقبال کا خوگر ہونا چاہیے۔

اقبال کی فکر میں، اسلامی تاریخ وتہذیب کا احساس، ایک مستقل عنصر کے طور پر موجود رہا۔ وہ اپنی تاریخ کے مدّاح بھی ہیں اور مصور بھی، اپنی تاریخ کے جو اوراق اپنے چشمِ تصور سے اقبال نے دیکھے، وہ انہیں اپنے جوانوں کو بھی دکھانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ایک طرف اقبال افکار اسلام اور قرآن کے شارح ومؤید ہیں تو دوسری طرف 'ربط وضبط ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات' کی فکر کے داعی اور اس حوالے سے عالمِ

اسلام کے لیے حساس بھی۔

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ ،زندہ شو

(یعنی اپنی تاریخ کو محفوظ کر کے بقائے دوام حاصل کرو، گزرے ہوئے زمانے سے بھی زندگی مل سکتی ہے۔)

مطالعۂ اقبال کی کئی سطحیں ہیں، نصابی سطح بھی ہے، اعلیٰ سطح بھی اور ایک سطح یہ بھی ہے کہ خاص نوجوانوں کے فہم کے مطابق مختلف گوشہ ہائے اقبالیات پر متوسط درجے کی کتابیں لکھی اور نوجوان طبقے تک پہنچائی جائیں تاکہ نسلِ نو کی ذہن سازی میں فکرِ اقبال کا حصہ بھی شامل کیا جائے۔ زیرِ نظر کتاب اقبال اور افغانستان بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر تصنیف کی گئی ہے۔ یہ کتاب محققین، دانشوروں اور اساتذہ فن کے لیے نہیں بلکہ اقبال کو سمجھنے اور جاننے کے خواہشمند عام قارئین اور طلبہ کے لیے ہے۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کی اسلامی تاریخ سے گہری وابستگی اور دلچسپی کو ''افغانستان'' کے حوالے سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ استعماریت کی زنجیروں سے آزاد افغانستان کو علامہ اقبال امتِ مسلمہ کے لیے ایک استعارہ سمجھتے تھے، آزادی اور اُمید کا۔

۸؍دسمبر ۲۰۱۸ء
نگار سجاد ظہیر
سابق صدر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونی ورسٹی
مدیرہ ششماہی ''الایام''، کراچی
ایسوسی ایٹ ایڈیٹر ''ہمدرد اسلامکس''، کراچی

باب اوّل

افغانستان: تاریخی پس منظر

جو ملک اب افغانستان کے نام سے موسوم ہے اس کا یہ نام صرف اٹھارھویں صدی کے وسط سے شروع ہوا۔ یعنی جب افغان قوم کو ایک مسلمہ سیادت حاصل ہوگئی اس سے پہلے اس ملک کے اقطاع کے الگ الگ نام تھے۔ پورا ملک ایک معینہ سیاسی وحدت نہیں تھا۔ ان میں نسلی یا لسانی وحدت بھی نہیں تھی۔ افغانستان کا قدیم ترمفہوم محض ''افغانوں کی سرزمین'' تھا۔[1]

ان علاقوں میں جو، اب افغانستان کہلاتے ہیں پہلے اور دوسرے ہزار سالہ دور قبل مسیح میں جب آریائی اقوام کی نقل مکانی جاری تھی یہاں ایرانی قبائل بستے تھے جنہیں کوروش (سائرس)[2] نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ہخامنشی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ سکندر اعظم[3] کی فتوحات (۳۳۰ ق۔م تا ۳۲۳ ق۔م) کے بعد یہ علاقے یونانی، باختریوں اور پارتھیوں کے درمیان موجبِ نزاع بنے رہے۔

پہلی صدی قبل مسیح میں یوچی (Yueh-Chi) قوم کے قبیلہ کوشان (Kushan) کی زیر قیادت ایرانی قبائل کی ایک نئی رُوان علاقوں میں داخل ہوئی۔ اس کے بعد یہ علاقہ کوشانی سلطنت کے زیر تحت رہا اور ترقی کرتا رہا۔ انہی کے دور میں فتوحات کا دائرہ بھی بڑھنے لگا اور کابل وغزنین، گندھارا، سوات و پشاور تک علاقہ کوشانی ریاست میں داخل ہوگیا۔

یہ کوشانی سلطنت چوتھی صدی عیسوی کے نصف اوّل میں شاپور ثانی کے عہد میں

ساسانیوں سے مغلوب ہوگئی، اوران علاقوں میں ایک اور حکمران طبقہ اُبھرا یہ چیونی (Chionites) تھے،نسلاً یہ بھی ایرانی تھے اور باختر میں آباد تھے تاریخ میں یہ اپنے حکمران خاندان کے نام پر ھیاطلہ (Hephtalites) کے نام سے معروف ہوئے۔ یہ ساسانی بادشاہوں ۴ کے باجگذار تھے۔

پانچویں صدی میلادی کے وسط میں سیاسی صورت حال بدل گئی۔ ھیاطلہ نے ساسانیوں پر غلبہ حاصل کرلیا اور ایرانیوں کے حاکم بن گئے اور ساسانی بادشاہ نصف صدی سے زائد عرصے تک ھیاطلہ کو خراج دیتے رہے۔ آخر ۵۶۰ء کے قریب وسط ایشیا کی سیاسی بساط پر ایک نئی قوم نمودار ہوئی ،یعنی ترک اور انہوں نے ھیاطلہ کا خاتمہ کر دیا۔اس کے بعد یہ علاقے چھوٹے بڑے امراء کے قبضے میں رہے جن میں سے بعض ساسانیانِ ایران کے باجگذار تھے اور بعض ترکوں کے۔

ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں مشرقی افغانستان کی سیاسی کیفیات کا نقشہ چینی سیاح ھیون سانگ (Hioum-Tsang) کے سفر نامے میں کھینچا گیا ہے،ایک تاریخی مآخذ میں افغان قوم کا یہ اولین تذکرہ ہے۔۵

ساتویں صدی میلادی میں جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو افغانستان کی مملکت دو سیاستوں اور دو مذہبوں سے متاثر تھی۔ مغربی حصے یعنی بجستان (سیستان) ہرات اور اس کے ملحقہ علاقوں پر ایرانی ساسانیوں کا سیاسی ،ادبی اور مذہبی اقتدار قائم تھا،جن کا مذہب زردشیت ۶ تھا اور زبان پہلوی تھی ،مشرقی حصے یعنی وادیٔ دریائے کابل (گندھارا) میں کابل سے قندھار تک بدھ اور برہمنی مذاہب رائج تھے۔ ۷

ظہور اسلام کے وقت سلطنت افغانستان قبائلی حکمرانوں میں منقسم تھی اور یہاں پشتو، پہلوی، مغولی نیز سنسکرت کی پراکرتیں رائج تھیں۔ گویا پورا افغانستان یونانی، ہندی، مغل اور ایرانی عناصر سے مل کر بننے والا ایک مخلوط معاشرہ تھا۔

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ دراز ہوا تو ایران سے ساسانیوں کا خاتمہ ہوگیا اور ایران اسلامی ریاست میں شامل ہوگیا، حضرت عمرؓ کے زمانے میں خراسان بھی فتح ہوگیا یہ علاقہ افغانستان کی موجودہ مغربی سرحد سے متصل ہے۔ عہد فاروقی ہی میں اسلامی لشکر قندھار بلکہ سندھ کی حدود تک پہنچ گیا تھا۔ عہد عثمانی میں سیستان، کابل، مرو، ہرات، طخارستان اور کرمان وغیرہ فتح ہوگئے تاہم یہاں باغیانہ سرگرمیاں بھی عروج پر رہیں، جب جس حاکم کو موقع ملتا، اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیتا۔

اموی عہد میں محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم باہلی کی فتوحات کے نتیجے میں موجودہ افغانستان کا بڑا حصہ اسلامی حکومت کے زیر تحت آ گیا۔ نظم کے اعتبار سے عراقین (یعنی کوفہ اور بصرہ) کا گورنر ان مشرقی اضلاع کے معاملات کو بھی دیکھتا تھا۔ تاہم افغانستان کی حد تک خلافت راشدہ اور اموی سلطنت کا ایک سو بتیس سالہ دور جنگ وجدل ہی میں گذرا۔ جب تک بنو ہاشم اور بنو امیہ کے حامی قبائل میں اختلافات جاری رہے افغانستان کے باشندے آل ہاشم کے طرف دار رہے۔ تحریکِ عباسی میں افغانستان کے جن مقتدر خاندانوں نے خلافتِ بنی عباس کے قیام میں ابومسلم خراسانی کا ساتھ دیا تھا ان میں غور کا سوری خاندان قابل ذکر ہے۔ ۸

ہجرت کی پہلی دو صدیوں ہی میں اسلام نے افغانستان میں زردشتیت، بدھ مت اور برہمنیت کی جگہ لے لی۔ پورے ملک میں عربی زبان ورسم الخط پھیل گیا تاہم مشرقی علاقوں میں تقریباً ڈھائی سو سال تک سنسکرت رسم الخط عربی کے کوفی رسم الخط کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ خراسان، ہرات اور سیستان میں بھی موجودہ دری فارسی نے پہلوی زبان کی جگہ لے لی۔ اسلامی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، رجال اور سیرت بھی افغانستان میں رواج پا گئے۔ زرنج، بلخ، ہرات اور مرو وغیرہ میں بڑے بڑے اسلامی مدرسے کھل گئے اور اسی سرزمین سے مشہور زاہد اور بزرگ عالم پیدا ہوئے مثلاً امام ابوحنیفہؒ، ابن المبارکؒ، محمد بن کرّام سیستانی (بانی مذہب کرامیہ)، ابواسحٰق بن یعقوب محدث جوزجانی، مشہور صوفی بزرگ ابراہیم ادہم بلخی، ابوداؤد سجستانی (صاحبِ سنن)، ابی حاتم سہل بن محمد بن محدث سجستانی، ابومعشر بلخی (منجم) ابن قتیبہ مروزی (مؤرخ) بشار ابن برد

طخارستانی (شاعر) وغیرہ۔

اہل خراسان مثلاً البرامکہ کے ذریعے ایرانی تمدن اور عجمی آدابِ معاشرت عباسیوں کے دربارِ خلافت میں منتقل ہوئے۔ عربی زبان اور دری زبان نے مل کر موجودہ فارسی کی صورت اختیار کی۔ عرب فاتحین افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں آباد ہو گئے اس طرح ایک مخلوط تمدن اور ایک مخلوط نسل وجود میں آئی اور یہاں عربی آداب ورسوم کی اشاعت ہونے لگی۔ ہندوستان اور عراق، ایران اور شام کے مابین تجارت انہی افغان راستوں سے ہونے لگی اور خراسان اور سیستان بڑے بڑے تجارتی مراکز بن گئے۔

عباسیوں کا عہد عروج گذرا اور صوبوں پر مرکز کی گرفت کمزور پڑنے لگی تو مقامی امرا اور عمال سر اٹھانے لگے، لہٰذا یہاں طاہریوں، صفاریوں، دودمان، پشتون، فریغونیان، لودھیان، غزنویوں اور غوریوں وغیرہ کی حکومتیں قائم ہوئیں اور یہ سلسلہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اوائل سے شروع ہوا تو بارھویں صدی ہجری (یعنی اٹھارویں صدی عیسوی) تک چلتا رہا۔ اس تقریباً ایک ہزار سالہ دور میں افغانستان مختلف سیاسی وحدتوں میں بٹا رہا۔

تاہم افغانستان کی سب سے عظیم سلطنت کی بنیاد ۹۶۲ء میں خاندان غزنوی کے نام سے پڑی۔ یہ حکومت ۹۹۳ء میں سلطان محمود کو منتقل ہوئی جو غزنی کا رہنے والا تھا اور اس نے اس شہر کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا۔ محمود نے سب سے پہلے تو خراسان فتح کر کے وہاں سامانیوں کی حکومت ختم کی اور پھر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پنجاب کے راجہ سے ۱۰۰۰ء میں ملتان کا علاقہ چھین کر اپنی حکومت میں شامل کیا۔ اُس نے سومنات سمیت ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ ۱۰۲۱ء میں محمود غزنوی نے اسلام کا نور کشمیر میں پھیلایا اور اسلام کے عظیم پیغام سے کشمیر کی جنت نظیر وادی کو منور کر دیا۔

محمود کے دَور میں علم و ادب کی سرپرستی اور فارسی ادب کی ترویج کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دور میں حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی نے ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاھنامہ لکھا جو فارسی ادب کے عظیم شاہکاروں میں سے ایک ہے۔

غزنویوں کے شہر غزنی اور لشکر گاہ کو بعد میں غوریوں نے تباہ کیا۔ اگرچہ یہ دونوں عظیم شہر تباہ ہو گئے مگر ان شہروں سے منسوب مشہور نام ابوریحان البیرونی، حسن میمندی، عنصری، فرخی، منوچہری، اتابی، گردیزی اور بیہقی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

غوریوں نے فیروز کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ یہ شہر ہرات کے پاس واقع تھا اور اس کا ایک یادگار مینار چشت نامی گاؤں کے پاس آج تک موجود ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ جو ہندوستان میں دفن ہیں اور جنہوں نے حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے علاقے میں چلہ کشی کی تھی اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ، خواجہ عبداللہ انصاریؒ، نظامی، عروضی سمرقندی، فرید الدین عطارؒ، مولانا جلال الدین بلخیؒ اور مولانا نورالدین جامیؒ جیسے بزرگ سب افغانی تھے۔

منگولوں کے حملے

تیرھویں صدی کے اوائل میں غوری سلطنت کے آخری بادشاہ محمد غوری کی محمد خوارزم شاہ کے ہاتھوں شکست کے بعد افغانستان سلطان محمد خوارزم شاہ کے زیر اثر آ گیا جو خوارزمی خاندان کا رکن تھا۔ محمد خوارزم شاہ، سلطنت عباسیہ کے خلاف برسرِ پیکار ہوا اور ۱۲۱۸ء میں بغداد پر حملہ کرنے کے لیے ابھی اس نے کوچ کیا ہی تھا کہ اسے راستے میں اطلاع ملی کہ منگول حملہ آوروں نے چنگیز خان کی قیادت میں اس کی مملکت کے مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا ہے۔ محمد خوارزم شاہ نے یہ خبر سنتے ہی واپسی کا ارادہ کیا تاکہ منگولوں سے اپنے علاقے چھڑا سکے۔ مگر اُسے منگولوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی اور منگول حملہ آوروں نے افغانستان سمیت وسطی ایشیا کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ منگول اپنے ساتھ تباہی و بربادی کا سامان لائے اور ان کے ہاتھوں بلخ، ہرات اور غزنی کی تہذیبیں پیوندِ خاک ہو گئیں۔ ۱۲۲۷ء میں چنگیز خان کے انتقال کے بعد اس کی وسیع و عریض حکومت بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ افغانستان میں چودھویں صدی تک طوائف الملوکی اور انتشار کی کیفیت باقی رہی۔ یہ دَور تیمور کے آنے پر ختم ہوا۔

خاندان تیمور

تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور ترکستان، افغانستان، ایران، عراق اور شمالی ہندوستان کے بڑے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، تیمور کو اس وسیع وعریض علاقے پر قناعت نہ تھی وہ چاہتا تھا کہ چین پر بھی قبضہ کرلے۔ اسی خواہش کے تحت اس نے چین کا رخ کیا، مگر ۱۴۰۵ء میں چین کی سرحدوں کے قریب اس کی موت واقع ہوگئی۔

تیمور کے جانشینوں کا دور پُرامن دَور تھا۔ یہ دَور جو تقریباً ایک صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ افغانستان کے لیے امن واستحکام کا زمانہ تھا۔ تیمور خاندان کے سلسلے کا آخری بادشاہ سلطان حسین بایقرا تھا جس کا عہد افغان تاریخ میں بڑا ممتاز تھا۔ تیمور خاندان کا خاتمہ سولھویں صدی کی ابتدا میں ہوا اور ایران کے صفوی خاندان اور وسط ایشیا کے شیبانی خاندان نے ان علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ غزنی اور کابل ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے حصے میں آئے۔ یہ صورت حال اٹھارھویں صدی کے اوائل تک جاری رہی۔ جب قندھار میں ایک قومی تحریک نے صفوی خاندان کی حکومت کو ختم کیا اور اس طرح افغانستان نے اپنے عہدِ جدید کی طرف پیش رفت شروع کی۔

افغانوں کی پہلی قومی حکومت

۱۷۴۷ء میں جب ایران کے صفوی خاندان کے بادشاہ نادر شاہ کا قتل ہوا تو افغانوں نے سلطنت ایران کا طوقِ غلامی اپنے گلے سے اُتار پھینکا اور احمد شاہ ابدالی کو اپنا حکمران منتخب کرلیا۔

احمد شاہ ابدالی ہرات کے گورنر محمد زمان خان کا بیٹا تھا۔ جس کا تعلق افغانستان کے سدّوزئی قبیلے سے تھا جسے افغانستان میں بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور یہ وہاں کا بااثر ترین خاندان تھا۔ احمد شاہ ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں حکمران منتخب ہوا اور تقریباً رُبع صدی (۱۷۴۷ء تا ۱۷۷۳ء) تک افغانستان پر حکومت کی۔ اس نے قندھار کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ''دُرِّ دُرّان'' کا لقب اختیار کیا۔ لہٰذا اُسے احمد شاہ دُرّانی بھی کہتے ہیں۔ احمد شاہ نے

اپنی سلطنت کو فتوحات کے ذریعے وسیع کیا، اس کی سلطنت میں کشمیر، سندھ اور مغربی پنجاب کے علاقے بھی شامل تھے۔ اس کی سلطنت کی حدیں ایک طرف مشرقی ایران سے شمالی ہندوستان تک اور دوسری طرف آمو دریا سے بحر ہند تک وسیع تھیں۔9 بالآخر ۱۸۱۸ء میں دُرانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ۱۸۲۶ء میں دوست محمد تخت نشین ہوا جو پہلا بارک زئی امیر تھا۔

بارک زئی خاندان کی حکومت

دوست محمد خان، بارک زئی سلطنت کا بانی تھا۔ دوست محمد جو ''امیر کبیر'' (Great Amir) کے نام سے افغانستان کی تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ ۱۷۹۲ء میں قندھار میں پیدا ہوا۔ اپنے والد پائندہ خان کے قتل کے بعد وہ غزنی کا نائب گورنر رہا۔ ۱۸۲۴ء میں اس نے خود کو کابل کا امیر ڈکلیئر کر دیا اور دو سال کے اندر اندر پورے افغانستان پر قابض ہو گیا۔ اس نے ۱۸۳۷ء میں جنگ جمرود میں سکھوں کو شکست دی تھی اور اس وقت اس نے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا تھا۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت اس وقت دوست محمد کی سخت مخالف ہو گئی جب دوست محمد نے ایران اور فرانس سے تعلقات استوار کیے اور ایک روسی ایجنٹ کو کابل آنے کی اجازت دی۔ وجہ یہ تھی کہ دوست محمد برطانیہ کی سکھ نواز پالیسی سے سخت ناراض تھا۔10

بہر حال اس کے جواب میں برطانوی فوجوں نے ۲۳ر جولائی ۱۸۳۹ء کو افغانستان پر حملہ کر دیا۔ ۲ر نومبر ۱۸۴۰ء کو دوست محمد نے ہتھیار ڈال دیے، برطانوی فوجیں اُسے بطور جنگی قیدی اپنے ساتھ ہندوستان لے گئیں۔ لیکن اس کے پیچھے افغانستان کے حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ برطانیہ کو دوست محمد کو رہا کرنا پڑا، تین سالہ جلاوطنی کے بعد اس نے ۱۸۴۲ء میں دوبارا حکومت شروع کی۔ اُسے دوبارا سے قندھار اور ہرات فتح کرنے پڑے۔ ۱۸۶۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور ریاست اس کے بیٹوں کو مل گئی۔ دوست محمد نے دوبارا حکومت ملنے کے بعد روس اور برطانیہ کے درمیان غیر جانبدارانہ حکمت عملی اختیار کیے رکھی۔ دوست محمد کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں محمد افضل اور محمد اعظم نے قلیل عرصے حکومت کی اس کے بعد یہ حکومت اس کے

ایک اور بیٹے شیر علی کو مل گئی اس کے زمانے میں دوسری افغان-برطانیہ جنگ ہوئی جو ۷۹-۱۸۷۸ء میں ہوئی جس کے نتیجے میں برطانوی افواج نے افغانستان کا ایک بہت بڑا حصہ قبضے میں لے لیا۔ اس جنگ کی وجہ شیر علی کی روس نواز حکمتِ عملی تھی۔

افغان تاریخ کے اس مرحلے پر ایک ایسا شخص سامنے آیا جس کی اُس وقت افغانستان کو ضرورت تھی۔ یہ امیر دوست محمد کا پوتا عبدالرحمٰن تھا۔ وہ ۱۸۶۸ء سے جلاوطن تھا۔ برطانیہ نے عبدالرحمٰن خان کو کابل کے امیر کے طور پر تسلیم کرلیا۔ امیر عبدالرحمٰن نے بڑی محنت اور ذہانت سے اپنے زیرِ سلطنت علاقوں میں امن وامان بحال کیا مگر اسے زیادہ عرصہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا، ۱۹۰۱ء میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا امیر حبیب اللہ خان تخت نشین ہوا۔

امیر حبیب اللہ خان

امیر عبدالرحمٰن کا بیٹا امیر حبیب اللہ خان ۲۱ر اپریل ۱۸۷۱ء میں سمرقند میں پیدا ہوا۔ اپنے والد کے دورِ حکومت میں اس نے نظم ونسق میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ والد کے انتقال کے بعد ۳ر اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اس نے افغانستان کی بادشاہی سنبھالی اور ''سراج الملت والدین'' کا لقب اختیار کیا۔ اس نے فوجیوں کی تنخواہیں بڑھائیں، سیاسی قیدیوں کو رہا کیا اور عوام سے اصلاحات کا وعدہ کیا۔

برطانیہ نے امیر عبدالرحمٰن سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس میں کچھ تبدیلیاں چاہتا تھا۔ برطانیہ نے نئے امیر پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ سابقہ معاہدے میں تبدیلیوں کے لیے تیار ہو تب ہی برطانیہ اس کی حکمرانی کو تسلیم کرے گا۔ برطانیہ کے شدید دباؤ کے باوجود امیر حبیب اللہ سابقہ معاہدے میں تبدیلیوں پر تیار نہیں ہوا۔

دسمبر ۱۹۰۴ء میں بالآخر امیر حبیب اللہ انڈیا میں تعینات برطانوی فارن سیکرٹری L.W.Dane سے کابل میں ملا اور اس پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ امیر عبدالرحمٰن کے ساتھ کیے جانے والے معاہدے میں تبدیلیاں کرنے کے بجائے نیا معاہدہ کرے۔ بالآخر مارچ ۱۹۰۵ء میں جو

معاہدہ ہوا وہ امیر حبیب اللہ کی واضح فتح تھی۔اس معاہدے میں برطانیہ نے حبیب اللہ کو افغانستان کا خودمختار حکمران تسلیم کیا۔برطانیہ نے افغانستان کی امداد بھی بڑھا کر چالیس سال کے لیے ۱،۶۰،۰۰۰ پونڈ کر دی۔اس معاہدے کے بعد برطانیہ نے افغانستان پر براہ راست حکومت کرنے کے بجائے بالواسطہ حکمرانی کا فیصلہ کیا۔افغانستان سے برطانوی فوجی واپس چلے گئے اور امیر حبیب اللہ نے افغانستان کو برطانوی تسلط اور اثرات سے نکال لیا۔

امیر حبیب اللہ نے مغربی ٹیکنالوجی میں بہت دلچسپی لی اسی کے زمانے میں افغانستان دورِ جدید میں داخل ہوا۔اس نے گاڑیاں درآمد کیں اور ملک میں سڑکیں تعمیر کیں۔۱۹۰۴ء میں حبیبیہ اسکول قائم کیا جو افغانستان میں جدید علوم کا پہلا اسکول سمجھا جاتا ہے۔کابل میں بجلی مہیا کی گئی۔۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ نے ہندوستان کا دورہ کیا اور برطانوی وائسرائے لارڈ منٹو نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔۱۹۱۰ء میں پہلی ٹیلی فون لائن کابل اور جلال آباد کے درمیان بچھائی گئی۔۱۹۱۱ء میں "سراج الاخبار" کے نام سے محمود ترزی (طرزی) نے اخبار نکالنا شروع کیا۔

تاہم افغانستان اور برطانیہ کے تعلقات میں اس وقت شدید کشیدگی آ گئی جب امیر حبیب اللہ کو یہ معلوم ہوا کہ روس اور برطانیہ جلد ہی ایک ایسا معاہدہ کرنے والے ہیں جس کے تحت افغانستان (اور ایران) کو معاشی اعتبار سے دو حلقۂ ہائے اثر میں تقسیم کر دیا جائے گا (برطانوی اور روسی حلقۂ اثر) اور دونوں کے تجارتی نمائندے کابل میں موجود ہوں گے۔دونوں طاقتوں نے امیر حبیب اللہ کو دعوت دی کہ وہ اس معاہدے کی توثیق کر دے،لیکن اس نے انکار کر دیا۔

اس دوران دنیا پہلی جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ گئی۔بظاہر حبیب اللہ نے جنگِ عظیم کے دوران غیر جانبدرانہ حکمت عملی برقرار رکھی لیکن اس کی شدید خواہش تھی کہ ملک پر سے برطانیہ کے اثرات بالکل ختم ہو جائیں۔لہذا اُس نے جرمن مشن کو کابل میں خوش آمدید کہا،حالانکہ برطانوی وائسرائے برائے انڈیا نے اس موقع پر امیر حبیب اللہ کو سخت وارننگ دی تھی۔اس جرمن مشن میں کچھ ترک اور انڈین بھی تھے۔تاہم اس سے قبل کہ امیر حبیب اللہ جرمنی سے کوئی معاہدہ کرتا برطانیہ نے غیر جانبدار رہنے کے عوض بھاری امداد کا وعدہ کیا اور یوں حبیب اللہ کو جنگ سے باہر رکھا گیا۔

جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی برطانیہ نے افغانستان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ایک سازش کے ذریعے امیر حبیب اللہ کو ۲۰ رفروری ۱۹۱۹ء میں قتل کرادیا۔اس کے قتل کے بعد سردار امان اللہ جو اس کا بیٹا تھا تخت نشین ہوا۔

امان اللہ خان

امان اللہ خان کا سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے بادشاہت سنبھالتے ہی افغانستان کی آزادی کا اعلان کردیا۔۳ رمارچ ۱۹۱۹ء کو اس نے وائسرائے کو اپنے بادشاہ بننے کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کا مطالبہ کیا کہ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ اپنے معاہدوں پر نظر ثانی کرے۔وائسرائے نے اس کا حوصلہ افزا جواب نہ دیا چنانچہ امان اللہ خان نے اپنی فوج کو مشرقی سرحدوں پر تیار رہنے کا حکم دیا۔

۳ رمئی ۱۹۱۹ء کو برطانوی اور افغان فوجوں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوا۔پہلی اور دوسری افغان۔برطانیہ جنگوں (Anglo-Afghan war) میں برطانوی افواج نے افغانستان پر قبضہ کیا تھا مگر اس دفعہ افغان افواج نے ہندوستان کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔اس دوران سرحدی قبائل انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے،برطانوی فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۳۱ رمئی ۱۹۱۹ء کو جنگ بندی ہوئی اور اگست ۱۹۱۹ء میں مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں برطانیہ نے ایک بار پھر افغانستان کی آزادی کو تسلیم کرلیا اور یوں آخر کار افغانستان ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت اختیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

آزادی کے بعد امان اللہ خان نے بڑے پیمانے پر اصلاحات کیں، ۱۹۲۷ء میں امان اللہ خان نے عالمی دورہ کیا تاکہ اپنے پسماندہ ملک کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کے لیے امداد حاصل کریں۔افغانستان میں پہلا ہوائی جہاز وہی لے کر آئے،جون ۱۹۲۸ء میں وہ کابل پہنچے جہاں انہوں نے نمائندہ قبائلی سرداروں کا ایک بہت بڑا جرگہ کیا اور افغانستان کو جدید بنانے کے لیے اپنا پروگرام پیش کیا۔

امان اللہ خان بالواسطہ طور پر مصطفےٰ کمال سے بے حد متاثر تھے مگر افغان اور ترک معاشرے میں بہت فرق تھا۔ افغان معاشرے میں پسماندگی کے ساتھ ساتھ مذہب بھی اپنی انتہائی دقیانوسی شکل میں موجود تھا جس سے فائدہ اٹھا کر امان اللہ خان کے مخالفین نے مختلف قبائل کو بغاوتوں پر ابھارا۔ ان قبائلی بغاوتوں کو انگریزوں کی مالی امداد بھی حاصل تھی۔

اس دوران بعض افغان علما نے امان اللہ خان کے جدید خیالات ونظریات کے خلاف فتوے دیے اور لوگوں کو بادشاہ کے قتل پر اکسایا۔ یہ بغاوتیں اتنی بڑھیں کہ امان اللہ کو اپنے بھائی سردار عنایت اللہ کے حق میں دستبردار ہوکر خاموشی سے قندھار جانا پڑا۔ سردار عنایت اللہ بھی تین دن بعد حکومت چھوڑ کر قندھار آ گئے، ان دنوں حبیب اللہ نامی ایک ڈاکو جسے "بچۂ سقہ" کہتے تھے، پارہ چنار میں مقیم تھا انگریزوں کی پشت پناہی سے کابل میں داخل ہوا اور اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۲۹ء کے موسمِ بہار میں امان اللہ خان نے ایک بار پھر قندھار میں ایک بہت بڑی فوج اکٹھی کی اور اپنے تخت کو دوبارا حاصل کرنے کے ارادے سے کوچ کیا۔ وہ غزنی تک آنے میں کامیاب ہوگیا مگر شدید مزاحمتوں کے پیشِ نظر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور ہندوستان سے ہوتا ہوا روم چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی افغانستان کی تاریخ میں امان اللہ کا کردار ختم ہوگیا۔

بچۂ سقہ کی حکومت

بچۂ سقہ کا اصل نام حبیب اللہ تھا۔ اسے بچۂ سقہ اس لیے کہتے تھے کہ وہ ایک سقہ (Water Carrier) کا بیٹا تھا۔ کابل کے شمال میں کوہ دامن ڈسٹرکٹ کے ایک گاوں کالا خان سے اس کا تعلق تھا۔ یہ امان اللہ کی اصلاحات کا سخت مخالف تھا۔ اُس نے اصلاحات مخالف عناصر کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ برطانیہ نے اس کی پشت پناہی کی اور اُس نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ حبیب اللہ تاجیک تھا۔ جو کہ افغانستان کا اقلیتی نسلی گروہ تھا۔ حبیب اللہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا تھا اور معمولی نوعیت کا کام کرتا رہا۔ مثلاً افغان سرکاری افسر کا ملازم رہا بعد میں جمال پاشا (عثمانی وزیر) کی رجمنٹ سے وابستہ ہوگیا۔ یہاں اس پر ۱۹۲۴ء کو بغاوت کے حوالے سے الزامات

لگائے گئے تو وہ بھاگ کر پشاور چلا گیا، جہاں کچھ عرصہ وہ چائے فروخت کر کے گذارہ کرتا رہا پھر پاراچنار چلا گیا، یہاں ایک گھر کو توڑنے کے الزام میں گیارہ ماہ جیل میں رہا۔اس کے بعد وہ ایسے ڈاکو کے روپ میں سامنے آتا ہے جو غریبوں پر مہربان تھا اور امیروں اور دولت مندوں کو لوٹتا تھا۔

اُس کی بادشاہت کو شروع ہی سے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا وہ قبائل جو امان اللہ کی پالیسیوں کے خلاف تھے انہوں نے بھی بچہ سقہ کی حکومت کو ناپسند کیا۔شنواری قبیلہ جس نے امان اللہ کے دَور میں خانہ جنگی شروع کر رکھی تھی اُس نے بھی بچہ سقہ کی حکومت کو ناراضگی کی نظر سے دیکھا۔لیکن برطانیہ نے حبیب اللہ (بچہ سقہ) کو ۷۵۰،۰۰۰ (ساڑھے سات لاکھ پاونڈ) کابل کے شاہی محل کو فتح کرنے پر ادا کیے تھے۔

بچہ سقہ کی حکومت پر ملک بھر میں عام ابتری پیدا ہوگئی تو سپہ سالار محمد نادر خان جو فرانس میں اپنا علاج کرا رہا تھا، ملک واپس آیا۔جنگِ استقلال میں افغانستان میں اُس نے بڑی عزت حاصل کر لی تھی۔تاہم بعض ملکی پالیسیوں پر امان اللہ سے اختلافات کی وجہ سے فرانس چلا گیا تھا۔نادر خان نے واپس آ کر قوم کو امن واتحاد کی دعوت دی اور اعلان کیا کہ حکومت کا آخری فیصلہ قومی نمائندوں (جرگہ) پر چھوڑ دی جائے۔بچہ سقہ سے بھی کہا گیا کہ اپنا معاملہ قوم کے حوالے کر دے۔کئی مہینوں کی کوششیں جب کامیاب نہ ہوسکیں تو اُس نے قبائلی فوج فراہم کر کے اپنے دو بھائیوں شاہ ولی خان اور شاہ محمود خان کی معیت سے کابل پر قبضہ کر لیا جہاں لوئی جرگہ نے ۱۲/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو نادر خان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

نادر خان

نادر خان سردار محمد یوسف خان کا بیٹا تھا، امان اللہ خان کے دَور میں اسے بڑی اہمیت حاصل تھی مگر جلد ہی نادر شاہ اور امان اللہ کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں امان اللہ خان نے نادر شاہ کو فرانس میں سفیر بنا کر بھیج دیا تھا۔

نادر شاہ کو جب اطلاع ملی کہ امان اللہ خان افغانستان کا تخت چھوڑ چکا ہے تو اس نے فوراً پشاور کا رخ کیا اور پھر ۲۵ر جنوری ۱۹۲۹ء کو وہ اپنی طاقت مجتمع کر کے کابل کے لیے روانہ ہوا۔ کئی ماہ کی جدوجہد کے بعد بالآخر ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وہ کامیاب ہوا۔ حبیب اللہ (بچۂ سقہ) کو حکومت چھوڑنی پڑی اور اس طرح نادر شاہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے مخالفین کو عبرتناک سزائیں دیں۔ جو لوگ نادر شاہ کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ان میں سے ایک شخص غلام نبی چرخی بھی شامل تھا۔ غلام نبی چرخی کے ایک منہ بولے بیٹے نے ایک تقریب میں نادر شاہ کو قتل کر دیا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو نادر شاہ کے ۱۹ سالہ بیٹے ظاہر شاہ نے عنان حکومت سنبھالی۔ [۱۱]

محمد ظاہر شاہ

محمد ظاہر شاہ نے شاہ افغانستان کے طور پر ۱۹۳۳ء تا ۱۹۷۳ء تک حکومت کی۔ وہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوا۔ یہ نادر شاہ کا بچ رہنے والا اکیلا بیٹا تھا۔ اس کی تعلیم کابل اور فرانس میں مکمل ہوئی۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو شاہ افغان بنایا گیا۔ اُس نے ''المتوکل علی اللہ، پیرو دین متین اسلام'' کا لقب اختیار کیا۔ [۱۲]

امیر حبیب اللہ خان، امان اللہ خان، نادر شاہ اور ظاہر شاہ، افغانستان کے یہ چاروں حکمران علامہ اقبال کے ہمعصر تھے ان کا تفصیلی تذکرہ آنے والے ابواب میں کیا جائے گا۔

افغانستان میں روس اور برطانیہ کی دلچسپی

اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانستان کے معاملات میں روس اور برطانیہ کی مداخلت ایک مستقل عنصر کے طور پر نظر آتی ہے۔ پہلے افغانستان کا مغربی حصہ ایران اور مشرقی حصہ سلطنتِ مغلیہ کے زیر اثر تھا۔ تاہم ایران میں صفوی بادشاہ، نادر شاہ اور ہندوستان میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد افغانستان پر ان ملکوں کا اثر کم ہو گیا۔ اس کے بعد روس

کے تعلقات ایران کے ساتھ بڑھنے لگے اور ہندوستان پر برطانوی تسلط قائم ہونے لگا۔ ہندوستان میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے برطانیہ یہ چاہتا تھا کہ یا توافغانستان پر قبضہ کر کے اوراسے ہندوستان کے ساتھ ملا کراس پراپنی عملداری برقراررکھے۔اوریا پھرافغانستان کے معاملات پرنظر رکھےاوراس کو بفراسٹیٹ کے طور پر استعمال کرے۔

برطانیہ نے دوسرے راستے کوترجیح دی اورامیر دوست محمد کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات کا آغاز ہوا۔یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ دوست محمد خان نے گورنر جنرل ہند لارڈ آکلینڈ کولکھا کہ:''مجھ کواور میرے ملک کوآپ اپنا ہی تصورکریں۔''[۱۳]

دونوں کے تعلقات میں اس وقت بگاڑ آیا جب امیر دوست محمد نے برطانیہ سے، سکھوں کے خلاف مدد کی خواہش ظاہر کی ۔دوست محمد سکھوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے پریشان تھالہٰذا اس نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ رنجیت سنگھ کے مقابلے میں اس کی مدد کرے لیکن برطانیہ،سکھوں کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا،لہٰذا اس نے دوست محمد کو جواب دیا کہ برٹش گورنمنٹ کی حکمتِ عملی غیر جانبداری پرمبنی ہے۔اس کے نتیجے میں۱۸۳۸ء میں امیر دوست محمد نے برطانیہ سے سفارتی تعلقات ختم کرکے روس اورایران کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرلیے۔[۱۴]

اس بات پرافغانستان اور برطانیہ کے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے اوراس کے نتیجے میں دوافغان-برطانیہ جنگیں ہوئیں۔پہلی جنگ امیر دوست محمد کی زندگی میں اوردوسری اس کے جانشینوں کے زمانے میں۔

۱۔ پہلی افغان-برطانیہ جنگ(First Anglo-Afghan war)۱۸۳۹ء-۱۸۴۲ء کے درمیان ہوتی رہی،جس کے نتیجے میں برطانیہ نے کابل پرقبضہ کرلیا اورامیر دوست محمد خان کوگرفتارکر کے ہندوستان لے گیا لیکن جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا اُسے چند سال بعدرہا کرنا پڑا۔

۲۔ دوسری افغان-برطانیہ جنگ(Second Anglo-Afghan war) جو۱۸۷۹ء -

۱۸۷۸ء میں ہوئی، جس کے نتیجے میں برطانوی افواج نے افغانستان کا ایک بہت بڑا حصہ قبضے میں لے لیا۔اس جنگ کی وجہ بھی شیر علی کی روس نواز حکمتِ عملی تھی۔

۳۔ تیسری افغان-برطانیہ جنگ (ThirdAnglo-Afghan war) امان اللہ خان کے زمانے میں مئی ۱۹۱۹ء میں ہوئی جس کے نتیجے میں افغان افواج نے برطانوی ہندوستان (British India) کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور تمام سرحدی قبائل انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، برطانوی فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔اگست ۱۹۱۹ء میں ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں برطانیہ نے ایک بار پھر افغانستان کی آزادی کو تسلیم کرلیا اور یوں افغانستان ایک آزاد اور خودمختار کی حیثیت اختیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

حوالہ جات:

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ افغانستان، ج ۲، ص ۹۳۹ (دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۶ء)

۲۔ سائرس، یعنی کوروش اعظم، ایرانی تاریخ کا وہ بادشاہ ہے جس کے ہاتھوں آلِ ماد کی زبردست سلطنت کا ختم ہوئی۔سائرس نے آلِ ماد کے آخری فرمانروا پر فتح حاصل کرنے کے بعد اپنے مورثِ اعلیٰ ہخامنش کے نام سے ہخامنشی عہد کی تاسیس کی۔سائرس نے ۵۵۰ قبل مسیح سے ۵۲۹ قبل مسیح حکومت کی، اس دوران اس نے روسیوں کے اور ایشیائے کوچک کے تمام علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو دریائے سیحوں سے لے کر بحیرۂ احمر تک وسیع کرلیا تھا۔اس کی قائم کی ہوئی یہ حکومت دو سو بیس سال تک جاہ وجلال کے ساتھ قائم رہی۔بالآخر سکندر کے شہ زور ہاتھوں نے اسے ختم کردیا۔(دیکھیے: مطالعہ تہذیب، از نگار سجاد ظہیر، ص ۶۸، قرطاس، کراچی، طبع دوم ۲۰۰۷ء)

۳۔ سکندر یونان کی ریاست مقدونیہ کے حکمران فیلقوس (فلپ) کا بیٹا تھا، جس نے غیر معمولی فتوحات کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔

۴۔ ایران میں ساسانی بادشاہوں کا عہد ۲۲۶ء تا ۶۵۳ھ تک رہا۔

۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲، ص ۹۴۹

۶۔ ایرانیوں کے پیغمبر زرتشت کے ماننے والے۔

۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲، ص ۹۵۰

۸۔ ایضاً، ص ۹۵۷

۹۔ Ludwig W.Adamec,*HistoricalDictionary of Afghanistan*,P.24, London1991.

(یہ وہی احمد شاہ ابدالی ہے جس نے متعدد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی پر ایک سے زائد مرتبہ حملہ کیا۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو بھی شکست دی تھی لیکن اس نے پنجاب سے آگے کسی صوبے کو اپنی حکومت میں شامل نہیں کیا۔)

۱۰۔ *Historical Dictionary of Afghanistan*,P.65.

۱۱۔ *Historical Dictionary of Afghanistan*,P.164.

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۳۲

۱۳۔ ماہنامہ المعارف اعظم گڑھ، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۲۳ (بحوالہ روس و انگلستان از سید محمد حسین موہانی، ۱۸۸۸ء، ص ۳۳۔۳۵)

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۴۴

باب دوم

علامہ اقبال: زندگی پر ایک نظر

علامہ محمد اقبال عظیم مفکر اور صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ انہوں نے مشرق مغرب کے علوم وفنون کی روشنی میں انسانی ذہن کا گہرا مطالعہ کیا۔ فلسفہ اور تاریخ ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ خاص طور سے اسلامی تاریخ سے ان کی وابستگی ان کے اردو اور فارسی کلام سے جا بجا مترشح ہے۔ وہ غلام قوم میں پیدا ہونے والے ایک آزاد انسان تھے، یہی ان کی عظمت ہے۔

آپ ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد اقبال کے بزرگ کشمیری برہمن تھے اور کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش دیندار بزرگ تھے جن کے دو بیٹے عطا محمد اور محمد اقبال اور چار بیٹیاں فاطمہ بی بی، طالع بی بی، کریم بی بی اور زینب بی بی تھیں۔ اقبال کی والدہ کا نام امام بی تھا، ان کا تعلق سمبڑیال، ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے سے تھا۔ بالکل ان پڑھ تھیں لیکن نیک دل، سلیقہ شعار اور دیندار خاتون تھیں۔

علامہ اقبال نے ابتدائی تعلیم سید میر حسن کے مکتب سے حاصل کی، اس کے بعد اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں پہلی جماعت میں داخل ہوئے، اس وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ان کی فارسی اور عربی زبان کی استعداد بہت بہتر ہوئی۔ میٹرک

اور ایف۔اے تک عربی ان کا اختیاری مضمون تھا جبکہ فارسی انہوں نے لازمی مضمون کے طور پر پڑھی۔اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور عربی میں اوّل آنے پر انہیں تمغہ اور وظیفہ بھی ملا۔اس کے بعد وہ اسکاچ مشن کالج میں داخل ہوئے۔ یہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔بی۔اے میں اقبال کے اختیاری مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔اس کے بعد اقبال نے ایم۔اے فلسفہ کیا اور قانون کا امتحان بھی پاس کیا۔

اقبال کے پورے تعلیمی دور میں ان پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی شخصیت میر حسن کی تھی۔اگر یہ کہا جائے کہ میر حسن جیسے سرپرست اور باکمال استاد نے اقبال کو 'علامہ اقبال' بنایا تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔اقبال نے اس کا اعتراف یوں کیا ہے۔ ؎

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثل حرم، جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

(بانگ درا)

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اقبال کا تقرر اورینٹل کالج میں استاد کے طور پر ہو گیا، یہ ۱۳ رمئی ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔اورینٹل کالج میں انہوں نے فلسفہ، منطق، اقتصادیات اور تاریخ کے مضامین پڑھائے۔جون ۱۹۰۳ء میں وہ مستقل طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔

وہ مطالعہ کے بہت شوقین تھے، گھنٹوں مطالعہ میں مصروف رہتے۔اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء کے اوائل میں کانگڑے کا مشہور زلزلہ آیا جس کے جھٹکے لاہور میں بھی محسوس کیے گئے۔زلزلہ آیا تو اقبال پلنگ پر لیٹے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے۔ان کا ملازم علی بخش گھبراہٹ کے مارے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگا بھاگا پھرنے لگا۔اس کی بدحواسی

دیکھ کر اقبال نے کتاب سے نظر اٹھائے بغیر اس سے کہا "علی بخش ادھر اُدھر نہ بھاگو۔زینے میں جا کر کھڑے ہو جاؤ۔" پھر کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ ۱

اس دوران اقبال کا شاعرانہ کلام سامنے آنے لگا۔وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور ادبی رسائل میں بھی ان کی نظمیں شائع ہونے لگیں۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔آپ تین سال انگلستان میں رہے،درمیان میں چند ماہ کے لیے جرمنی بھی گئے۔جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں آج بھی ایک سڑک علامہ اقبال کے نام سے منسوب ہے۔تین سالہ قیام یورپ کا یہ دور علامہ اقبال کی زندگی کا اہم مرحلہ تھا۔اقبال کے ذہنی اور فکری ارتقاء میں یہ سفر بہت اہمیت رکھتا ہے۔قیام یورپ کے مشاہدات وتجربات سے اقبال کی فکر ونظر کو بڑی وسعت ملی۔

اقبال نے کیمرج میں داخلہ لیا۔اس زمانے میں انگلستان میں پی۔ایچ ڈی نہیں ہوتی تھی بلکہ کیمرج کے طلبہ کو جرمنی جانا پڑتا تھا۔اقبال نے بھی قیام انگلستان میں رکھا اور جرمنی سے ڈگری حاصل کی۔انہیں لنکنز ان (Lincon Inn) سے بارایٹ لاء کی بھی ڈگری مل گئی۔ ۲

علمی اور تعلیمی اکتسابات کے لحاظ سے یہ اقبال کی زندگی کا سب سے باثروت زمانہ تھا۔انہوں نے تین سال میں کیمرج سے بی۔اے ،میونخ (جرمنی) سے پی۔ایچ ڈی اور لنکنز ان سے بارایٹ لاء کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۳

اقبال ۳ رجولائی ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے وطن کے لیے روانہ ہوئے۔واپسی کے سفر میں جب ان کا بحری جہاز اطالیہ کے جزیرے سسلی (صقلیہ) کے ساحل کے قریب سے گزرا تو ان کے دل میں شدید جذبات کا تلاطم تھا۔انہوں نے سسلی (صقلیہ) پر ایک پُر اثر نظم لکھی جس کا ذکر نویں باب "مسلم صقلیہ۔تہذیب حجازی کا مزار" میں کیا گیا ہے۔

وطن واپسی پر آپ نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا کچھ وقت کے لیے درس وتدریس سے

بھی وابستہ رہے۔ وکالت کی مصروفیات اور بھرے پُرے خاندان کی وجہ سے اقبال کو شاعری کا مشغلہ جاری رکھنے میں خاصی دشواری تھی لیکن مسلمان جس عرصہ غلامی میں تھے اور حالات ان کے لیے جیسے سنگین تھے اس کی وجہ سے اقبال ایک اضطراب اور بے چینی کا شکار رہتے۔

۱۹۱۱ء تخلیقی لحاظ سے اقبال کی زندگی کا اہم سال تھا جس میں ''شکوہ'' جیسی نظم لکھی گئی اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پیش کی گئی۔ ''ترانہ ہندی'' کے بعد ''ترانہ ملی'' لکھا گیا۔[۴]

۱۹۱۵ء میں مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی تکمیل، کتابت اور طباعت واشاعت ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں مثنوی کا دوسرا حصّہ ''رموز بیخودی'' شائع ہوا پھر دونوں حصّوں کو یکجا کر کے مثنوی کا نام ''اسرار و رموز'' رکھا گیا۔ اب اقبال کو ایک مفکر اور دانشور کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا تو ہندوستان میں ہنگامی قانون دفاع ہند (Defence of India Act) کی جگہ رولٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا۔ اس کے خلاف گاندھی کی ستیہ گرہ تحریک کے سبب جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا اور پنجاب کے اکثر اضلاع میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء کے اجلاس بیک وقت ہوئے۔ اقبال بھی اس موقع پر امرتسر آئے۔ اقبال خلافت کمیٹی میں اس مسئلے کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے شامل تھے، مگر جب خلافت کمیٹی نے قیادت کی باگ ڈور گاندھی کے حوالے کردی اور گاندھی نے اس کا رُخ اپنے سیاسی مقاصد کی طرف موڑ دیا تو اقبال اس سے الگ ہو گئے اور ''پیام مشرق'' لکھنے میں مصروف رہے۔[۵]

اقبال جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے[۶] کے ''دیوانِ غربی'' کے جواب میں ''پیامِ مشرق'' لکھ رہے تھے جو پہلی بار اپریل ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اقبال کی اہم نظمیں ''خضرِ راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' بھی انہی برسوں میں لکھی گئیں اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سالِ نو کے موقعے پر حکومت نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ''نائٹ ہڈ'' یعنی ''سر'' کا خطاب دیا۔

اقبال پیشہ ورانہ مشاغل کے علاوہ عصری دینی مسائل اور سیاسی معاملات میں یکساں دلچسپی لیتے تھے، وہ ان مسائل پر غور وفکر کرتے، نظمیں لکھتے اور مقالات تحریر کرتے رہے۔ انہوں نے بعض مضامین انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھے۔ اس حوالے سے ان کے خطبات جوانہوں نے مدراس میں دیے انتہائی اہم ہیں۔ یہ خطبات Reconstruction of Relegious Thought in Islam کے نام سے بار بار شائع ہوئے۔ اس کے کئی اردو تراجم بھی دستیاب ہیں۔ یہ خطبات ان کی فکر کو پیش کرتے ہیں۔ یہی خطبات انہوں نے میسور، حیدرآباد دکن میں بھی دیے۔ ایک فلسفی اور شاعر کے طور پر اقبال کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی، لہٰذا وہ جہاں بھی گئے ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ واپسی میں وہ ایک ہفتے کے لیے علی گڑھ بھی گئے اور سر سید احمد خان کے قائم کردہ علی گڑھ کالج کے بارے میں بڑے حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔ ۷

اقبال کا ایک سیاسی وژن اور نکتہ نظر تھا۔ انہوں نے بھرپور سیاسی زندگی گزاری۔ عمر بھر مسلم لیگ کے رکن رہے، بے شمار سیاسی زعماء سے تعلق رکھا، ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب میں حصّہ لیا اور اسمبلی میں اہم کردار ادا کیا۔ کشمیر کمیٹی کے سکریٹری رہے، مسلم لیگ (شفیع لیگ) کے بھی سکریٹری رہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کو جداگانہ انتخابات پر قائل کیا۔ علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت قابل داد ہے کہ انہوں نے شروع ہی سے جداگانہ انتخابات کا اصولی موقف اپنایا اور کسی وقتی فائدے کی خاطر اصولوں سے دست بردار نہیں ہوئے۔ اقبال کے اس طرز عمل سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

اول: ان کے نزدیک مسلمانوں کا ملی تشخص ہر طرح کی منفعت اور مراعات سے بالاتر تھا۔

دوم: وہ ہندوؤں کی ذہنیت کا بخوبی ادراک رکھتے تھے۔ ۸

قائداعظم محمد علی جناح اور سر شفیع میں مفاہمت کے بعد اقبال اور جناح بھی ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آئے۔ ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی

صدارت علامہ اقبال نے کی۔ یہ اجلاس ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں ہوا جس میں علامہ اقبال نے اپنا تاریخ ساز خطبہ دیا۔ اقبال نے اس خطبے میں ہندوستان کو درپیش مسائل کا معروضی جائزہ لینے کے علاوہ مسلم قومیت اور ہندی قومیت کے تصوّرات کا عالمانہ تجزیہ کیا اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔

ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ آخر الذکر دونوں کانفرنسوں میں علامہ اقبال نے شرکت کی۔ دوسری گول میز کانفرنس بغیر کسی نتیجے کے ختم ہوگئی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں اور گاندھی جی کی غیر منصفانہ شرائط کی وجہ سے اقبال بہت مایوس ہوئے۔ کانفرنس میں شرکت کے بعد کئی ممالک میں سیاحت اور اہم شخصیات سے ملاقات کرتے ہوئے واپس آئے۔ ۲۲ر نومبر کو روم پہنچے۔ ۲۲ سے ۲۹ نومبر تک وہ روم میں رہے اور یہاں کے آثار قدیمہ دیکھے۔ ۲۵ اور ۲۷ نومبر کو افغانستان کے سابق شاہ امان اللہ خان سے ملاقات کی جو ان دنوں روم میں مقیم تھے۔ ۲۷ر نومبر ہی کو اقبال کی ملاقات مسولینی ۹ اور پرنس کیتانی ۱۰ سے ہوئی۔

۲۹ر نومبر کو اقبال (اطالیہ) اٹلی سے مصر کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہاں ایک ہفتے قیام کیا۔ ۶ر دسمبر کو فلسطین پہنچے جہاں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس تھا۔ اقبال نے بھی اس موتمر سے خطاب کیا۔ اس کے بعد وہ لاہور واپس آئے۔ یہ اقبال کا بڑا تاریخی سفر تھا۔

اگلے ہی سال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو انگلستان کے لیے روانہ ہوئے اور ۳۰ر دسمبر تک لندن میں رہے۔ یہاں انہوں نے کچھ لیکچر بھی دیے اور محمد علی جناح سے تفصیلی ملاقاتیں بھی کیں، انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش خطرات سے قائداعظم کو آگاہ کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ وہ وطن واپس آکر اپنا سیاسی کردار ادا کریں۔

اس بار اقبال واپسی کے سفر میں پیرس (فرانس) اور اسپین سے ہوتے ہوئے واپس آئے۔ پیرس میں قیام کے دوران وہ فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں ۱۱ سے ملے۔ اس زمانے میں

برگساں بہت ضعیف ہو چکے تھے، علامہ نے ان سے دو گھنٹے ملاقات کی اور اس کے نظریہ زماں پر گفتگو کی۔ اس کے بعد وہ اسپین گئے جہاں تین ہفتے قیام کیا۔ اسپین کی سیاحت اقبال کی زندگی کا بیک وقت خوشگوار اور رقت آمیز تجربہ ثابت ہوا۔ اس حوالے سے ان کی شاعری نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے اس باب کو دوبارا زندہ کر دیا۔

تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آ کر اقبال سیاسی اجتماعات اور جلسوں میں شرکت سے گریز کرنے لگے، ان کا زیادہ تر وقت غور و فکر اور مطالعے میں گزرتا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ کے اواخر میں علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی ۱۲ اور سر راس مسعود ۱۳ کے ہمراہ پشاور کے راستے افغانستان گئے۔ افغانستان کے حکمران محمد نادر علی شاہ نے انہیں تعلیمی مسائل میں مشورے کے لیے دعوت دی تھی۔ نصابی معاملات نبٹانے کے بعد اقبال افغانستان کی سیاحت کرتے ہوئے واپس آئے۔ اقبال نے بابر، محمود غزنوی، حکیم سنائی اور احمد شاہ ابدالی کے مقابر کی زیارت کی۔ کابل کے بعد غزنین اور قندھار ہوتے ہوئے براستہ کوئٹہ واپس آئے۔

جنوری ۱۹۳۴ء سے علامہ اقبال کو طبی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ دمہ کا مسئلہ، اختلاج قلب، ہاضمے کی خرابی، گردے کا درد اور آخری زمانے میں آنکھوں میں موتیا بھی اتر آیا۔ صحت کے ان مسائل نے اقبال کی سرگرمیوں کو بالکل محدود کر دیا تھا۔ وکالت پر بھی بہت اثر پڑا تھا۔

علامہ اقبال سیاسی صورت حال پر بہت پریشان اور دلبرداشتہ تھے، مسلمان سیاسی لیڈروں کے نفاق اور مفاد پرستی اور مسلمانوں کے انتشار سے بڑے برگشتہ خاطر تھے تاہم پھر بھی بساط بھر ان کے لیے حوصلہ افزا شاعری کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے ان کا گلا بیٹھ گیا تھا لہٰذا تقریر کرنے یا مشاعرے میں کلام سنانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، رفتہ رفتہ اقبال بالکل ہی گوشہ نشین ہو کر رہ گئے، اس علالت کے باوجود ملکی حالات پر ان کی گہری نظر ہوتی اور جس معاملے میں ضروری سمجھتے ردِّعمل میں اپنا بیان دیتے تھے۔

اقبال کی بیوی سردار بیگم بھی طویل اور شدید علالت کی لپیٹ میں تھیں۔ ان کا انتقال

۲۳ رمئی ۱۹۳۵ء کو ہوا۔ اقبال پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا۔ ان کے بچے جاوید اقبال اس وقت ۹ سال کے اور منیرہ صرف ۴ سال کی تھی۔ اپنی علالت اور گھریلو مسائل کے باوجود اقبال مطالعہ اور لکھنے میں مصروف رہتے۔ علاج کے لیے انھوں نے بھوپال کے تین سفر بھی کیے۔ ان کے ذہن میں کئی علمی منصوبے تھے لیکن انہیں مہلت نہ ملی اور ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کر گئے۔ لاہور میں دفن کیے گئے۔ سرزمین حجاز میں موت کی تمنا پوری نہ ہوئی۔

آرزو دارم کہ میرم در حجاز

(میری آرزو ہے کہ مجھے موت آئے تو سرزمین حجاز میں)

(رموز بے خودی)

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال: شخصیت اور فن، ص ۴۲، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۸ء

۲۔ ایضاً، ص ۸۳

۳۔ ایضاً، ص ۸۴

۴۔ دائرہ معارف اقبال، جلد اوّل، ص ۹، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور ۲۰۰۶ء

۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۶۔ گوئٹے (*J.W.Goethe*) ایک جرمن مصنف، دانشور اور سیاستدان تھا، اس نے ناول بھی لکھے، ڈرامے بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ اس کا انتقال ۲۲ رمارچ ۱۸۳۲ء میں، جرمنی میں ہوا۔

۷۔ علامہ اقبال: شخصیت اور فن، ص ۱۵۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۹۔ اٹلی کا حکمران، بینیٹو مسولینی (*Benito Mussolini*) ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا، اس کے والد ایک اسکول ٹیچر تھے۔ مسولینی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے

دوران فوجی خدمت انجام دیتے ہوئے وہ زخمی بھی ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد اُس نے اپنی سیاسی جماعت ''فاشسٹ پارٹی'' (Fascist-Party) کی بنیاد رکھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی جنگی اثرات کی وجہ سے سیاسی اور معاشی انتشار کا شکار تھا۔ مسولینی نے ان حالات میں اپنی اہمیت ثابت کی۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی حکومت قائم ہوگئی، اس نے ملک میں سخت آمریت قائم کی، تقریباً اکیس سال کی آمرانہ حکومت کے بعد ۱۹۴۳ء میں اُسے حکومت چھوڑنی پڑی۔ ۲۸ر اپریل ۱۹۴۵ء کو قتل ہوا۔ مسولینی عالمی جنگ میں ہٹلر کا اتحادی تھا۔

۱۰۔ پرنس کیتانی اٹلی کا صاحبِ حیثیت شخص تھا، اسے اسلامی تاریخ سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اُس نے کئی جلدوں پر مشتمل اسلامی تاریخ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا انتقال ہوا۔

۱۱۔ فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں (Bergson) ۱۸ر اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پیرس میں پیدا ہوا، وہ شروع ہی سے ایک ذہین اور متجسس طبیعت کا مالک طالب علم تھا۔ دورانِ تعلیم اس نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ عملی زندگی کا آغاز فلسفے کے استاد کے طور پر کیا۔ فلسفے پر اس نے کئی کتابیں لکھیں لیکن ۱۹۰۷ء میں شائع ہونے والی کتاب ''تخلیقی ارتقاء'' (*Creative Evolution*) سے اُسے عالمی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں اسے لٹریچر کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

۱۲۔ نامور عالم دین، مورخ اور مصنف سید سلیمان ندوی صوبہ بہار کے ایک گاوں دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۰۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور یہاں مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت اور علم سے فائدہ اٹھایا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی ادارے سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں وہ ''الندوہ'' کے ایڈیٹر بھی رہے، پھر اعظم گڑھ سے ماہنامہ ''معارف'' جاری کیا۔
جون ۱۹۵۰ء میں ساری املاک بھارت چھوڑ کر پاکستان آگئے اور کراچی میں رہائش اختیار کی۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ علامہ شبلی نعمانی کی نامکمل رہ جانے والی تصنیف سیرۃ النبی کی تکمیل ہے۔ اس کے علاوہ حیات شبلی، نقوش سلیمانی، خیّام، عرب وھند کے تعلقات اور ارض القرآن آپ کی بہت اہم تصانیف ہیں۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی میں فوت ہوئے۔

۱۳۔ سر راس مسعود، سر سید احمد خان کے پوتے اور سید محمود کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ۱۵ر فروری ۱۸۸۹ء

کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔زیادہ تر وہ اپنے دادا کے پاس ہی رہتے۔اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ یونی ورسٹی گئے۔۱۹۱۲ء میں واپس آ کر پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔علامہ اقبال سے گہرا تعلق خاطر تھا۔آپ کا انتقال ۱۹۳۷ء میں ہوا تو اقبال نے اپنے رنج وغم کا اظہار ایک منظوم مرثیے میں کیا۔

باب سوم

علامہ اقبال اورافغانستان

امت مسلمہ کا واضح تصور رکھنے والے علامہ اقبال کوافغانوں اور سرزمینِ افغانستان سے خاصی دلچسپی تھی۔ ہر اسلامی ملک کے مستقبل کے لیے وہ فکر مند تھے،جس عہد میں علامہ اقبال نے زیست کی (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) وہ مغربی استعمار کا دور تھا،کئی مسلمان ممالک استعماریت کے پنجۂ استبداد سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاوں مار رہے تھے۔مسلم ممالک میں جہاں آزادی اور بیداری کی تحریکیں چل رہی تھیں،علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ان میں ایک روح پھونکنے کی کوشش کی۔اقبال سمجھتے تھے کہ اگر اسلامی ممالک متحد ہو جائیں اور اغیار کے تسلط سے خود کو آزاد کرالیں تو وہ دن دور نہیں جب ابلیس کی کفن چور ذریت پر مشتمل انجمن اقوام کی جگہ اسلامی ممالک پر مشتمل ایک آزاد اور غیر جانبدار ''اسلامی جمعیت اقوام'' وجود میں آجائے گی جس سے اسلامی ممالک کی قسمت بدل جائے گی۔

دنیائے اسلام میں علامہ اقبال افغانستان کی سرزمین کو بڑی اہمیت دیتے تھے، دنیائے اسلام کی حیاتِ تازہ کے لیے وہ دلّی کے بجائے کابل کی طرف دیکھتے تھے۔علامہ کو افغانستان کی جغرافیائی اہمیت کا بھی احساس تھا چونکہ یہ آزاد لوگوں کی سرزمین تھی اور یہاں کے باشندے غیرتِ دینی سے بہرہ مند تھے اس لیے اقبال کو افغانوں سے بڑی اُمیدیں تھیں۔

Modern Afghanistan (جدید افغانستان) نامی کتاب کے تعارف میں

اقبال نے افغانستان کی جغرافیائی اہمیت کی طرف اشارا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قدیم افغانستان دنیا کا بڑا تجارتی مرکز تھا اور ازمنہ وسطیٰ تک اس کا یہی حال رہا۔ایشیا کی تاریخ وسیاست میں اس ملک کی حیثیت بنیادی رہی ہے اور رہے گی۔''[1]

علامہ اقبال نے افغانوں کی تاریخ،ان کی سیرت وکردار اور علاقائی اور عالمی سیاست میں ان کے منفرد مقام کی بنیاد پر ہی یہ کہا تھا۔ ع

افغان باقی، کہسار باقی

الحکم للہ ، الملک للہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان سے اقبال کی دلچسپی کا آغاز خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کے زمانے سے شروع ہوا۔[2] ۱۹۲۲ء میں انہوں نے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دینے کی تجویز پیش کی،۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق کا انتساب امیر امان اللہ (شاہِ افغانستان) کے نام سے کیا۔۱۹۲۵ء میں علامہ اقبال نے افغانستان میں ایک بین الملّی یونی ورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا۔۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ کے حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیا کا دل سمجھتے تھے۔

آسیا یک پیکر آب و گل است

ملتِ افغاں در آں پیکر دل است

از فسادِ او فسادِ آسیا

در کشادِ او کشادِ آسیا

(جاوید نامہ)

اس وقت افغانستان ایک آزاد ملک تھا جہاں استعماری طاقتوں کی زورزبردستی نہیں تھی۔علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ فطرت اپنے مخصوص مقاصد رکھتی ہے جن کو وہی قوم پورا کرسکتی ہے جو فطرت کے قریب تر ہو،جس کی زندگی جدّ وجہد سے عبارت اور جس کا رہن سہن سادہ

ہو، جس کو تہذیبِ جدید کے تکلفات، تصنع اور بناوٹ نے پامال نہ کیا ہو۔ ضربِ کلیم میں اقبال کہتے ہیں:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

علامہ اقبال نے ہمیشہ افغانوں سے بڑی توقعات وابستہ کیں اور مستقبل میں عالمِ اسلام کی قوت وثروت میں افغانوں کے کلیدی کردار کو اُجاگر کرنے کے لیے انہوں نے افغانوں کو امتِ مسلمہ کا مرکز ومحور کا درجہ دیا۔ جدید افغانستان نامی کتاب کے پیش لفظ میں افغانوں کی تین نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

''ان کا گہرا مذہبی شعور، نسل اور مرتبہ کے امتیازات سے مکمل خلاصی اور کامل توازن جسے انہوں نے اپنے قومی اور مذہبی آدرشوں میں ہمیشہ برقرار رکھا۔ قدامت پسندی کا یہ جوش افغانوں کے لیے ہمیشہ قوت کا سرچشمہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے ذریعے ماضی سے ان کا رشتہ زندہ وسلامت رہتا ہے اور وہ نئے زمانے کے مطالبات سے بے بہرہ نہیں ہو پاتے۔ ان کی قدامت پسندی نے انہیں اپنی روایات پر فخر کرنا سکھایا ہے لیکن روایت کے بوجھ سے ان کے اندر کی روح کے ارتقا میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔''[۳]

افغانوں کے بارے میں اقبال یہ سمجھتے تھے کہ ان میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو کسی بھی خوددار، جفاکش اور بہادر قوم میں ہو سکتے ہیں، اسلحے کا استعمال، قربانی کا جذبہ، غیرت ایمانی اس قوم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ افغان ایک ایسی قوم ہے جس نے کسی بھی غیر ملکی حکمرانوں کی غلامی کا طوق اپنی گردن پر زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا۔ مگر ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اقبال ان کی چند کمزوریوں پر نالاں نظر آتے ہیں مثلاً افغان اپنی قوت اور بہادری کو اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ ان میں تعلیم کی کمی ہے، عالمی حالات اور اس کے تقاضوں

سے واقف نہیں، ان کے ہاں صنعت و حرفت نہیں، قوت لا یموت کے لیے انہیں شدید محنت کرنی پڑتی ہے، وہ حکمرانوں اور گرد و پیش کی سازشوں سے آگاہ نہیں، چنانچہ اقبال انہیں جگاتے ہیں اور کہتے ہیں اے افغانو، اپنی خودی پہچانو اور اپنی اصلیت اور حقیقت سے آگاہ ہو، اقوام عالم کی بساط پر اپنا کردار ادا کرو کیونکہ مسلمانوں میں تم ہی آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب ہو۔

علامہ اقبال نے برطانوی سامراج کے تحت زندگی گزاری تھی۔ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ مستحکم ہو چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ مایوسی اور بے بسی کا زمانہ تھا خصوصاً ہندوستانی مسلمان بدترین دَور سے گزر رہے تھے، اس دَورِ ابتلا میں پڑوسی ملک افغانستان اپنی آزادی کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ افغانستان اور قرب وجوار کے غیور اور بہادر قبائلی مسلمان ایک طرف سے برطانیہ اور دوسری طرف سے روس کی جابر حکومتوں کے خلاف اپنی آزادی کو قائم رکھے ہوئے تھے، اس لیے علامہ اقبال افغانستان کو ایک مینارۂ نور اور اسے امید کی کرن سمجھتے تھے کہ مغربی سامراج کو اگر شکست دی جا سکتی ہے تو ایک کوہستانی علاقے میں، بہادر کوہستانیوں کے ذریعے ہی دی جا سکتی ہے۔ جن کی پرورش ایک آزاد فضا میں محنت مشقت، غیرت وخودداری کے ساتھ ہوئی ہے۔ اقبال کے خیال میں اگر ایمان کی جرأت ہو تو بڑی سے بڑی طاقت کے ساتھ ٹکر لی جا سکتی ہے۔ یہ جرأتِ ایمانی، دَورِ غلامی کے ہندوستان میں اقبال کو صرف افغانستان اور سرحد کے آزاد خطے میں نظر آتی ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ''بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' ایک نہایت ولولہ انگیز نظم ہے۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِدارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا
اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را! [۲۷]

علامہ اقبال کو ان آزاد علاقوں کے مردانِ حر سے جو توقعات تھیں انہیں اقبال کی خوش فہمی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ محض خوش عقیدگی اور خوش فہمی کا معاملہ نہیں تھا۔ اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ مادی اسباب و وسائل، صنعتی اور سائنسی ترقی اور ہتھیاروں کی اہمیت کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اقبال یہ بھی جانتے تھے کہ کسی بھی معرکے میں آخری فیصلہ ہتھیاروں سے نہیں، کردار سے ہوتا ہے۔ ایک بہادر انسان اپنی اخلاقی طاقت سے بڑے سے بڑا کام لے سکتا ہے۔ لہٰذا

مومن کی فراست کے لیے یہ اشارہ کافی ہے کہ حق وباطل اور کفر وایمان کے معرکے میں آخری فتح ایمان اور حق کی ہوگی۔

انہی خیالات کے تحت علامہ اقبال نے ضربِ کلیم کے آخر میں ''محراب گل افغاں کے افکار'' شامل کیے اور ان کے ذریعے افغانیوں کو ایک پیغامِ انقلاب دیا۔ اقبال کا خیال ہے کہ افغانوں میں ساری خصوصیات شجاعانہ موجود ہیں، اگر کمی ہے تو خود شناسی کی اسی لیے اس جانب ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستاں! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان، او غافل افغان
موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان، او غافل افغان
اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان
اپنی خودی پہچان، او غافل افغان
ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان
اپنی خودی پہچان، او غافل افغان
تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

یہ نظم خاصی طویل ہے اس میں افغانوں کی شجاعت و مردانگی اور تاریخی کارناموں

کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے۔اس پیغامِ انقلاب کے ساتھ ایک اور نظم میں افغانیوں کی انقلابی قوتوں کو اُبھارا گیا ہے۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہو بے داغ ضرب ہو کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

(ضربِ کلیم)

اٹھارھویں صدی عیسوی میں افغانستان کے معاملات میں روس اور برطانیہ کی مداخلت اور دلچسپی ایک مستقل عنصر کے طور پر نظر آتی ہے پہلے افغانستان کا مغربی حصہ ایران اور مشرقی حصہ سلطنتِ مغلیہ کے زیرِ اثر تھا۔تاہم ایرانی بادشاہ، نادرشاہ افشار۵ اور ہندوستان میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد افغانستان پر ان ملکوں کا اثر کم ہو گیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ایران کے ساتھ روس کے تعلقات استوار ہو گئے اور ہندوستان پر برطانوی تسلط بڑھنے لگا، تو دونوں (یعنی روس اور برطانیہ) کی نظریں افغانستان کی طرف اُٹھنے لگیں۔

برطانیہ کے لیے افغانستان کا سلسلہ ہائے کوہ۔کوہ ہندوکش اہم تھا جو افغانستان کے شمال مشرق سے لے کر جنوب مغرب تک تقریباً پورے ملک کی طوالت کو طے کرتا ہے۔یہ سلسلہ

کوہ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان قدرتی سرحد کی حیثیت رکھتا تھا اور برطانیہ کی یہ شدید خواہش تھی کہ اس قدرتی سرحد پر کوئی قابض نہ ہونے پائے۔

اسی وجہ سے افغانستان اور برطانیہ کے مابین تین جنگیں بھی ہوئیں۔ جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے افغانستان نے روس کی طرف دوستانہ انداز سے اس لیے ہاتھ بڑھایا تاکہ برطانوی مداخلت کا توڑ تلاش کر سکے، تاہم روس کو جب بھی موقع ملا اس نے افغانستان میں داخل ہونے سے گریز نہیں کیا۔ امیر عبدالرحمٰن کے زمانے میں روسی فوجیں افغان سرحدوں میں گھس آئی تھی اور ۱۸۸۴ء میں مرو پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ جس پر برطانیہ نے شدید ردِ عمل کا اظہار کیا تھا اور دونوں طاقتوں (یعنی روس اور برطانیہ) کے مابین جنگی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم یہ صورت حال ۱۸۸۵ء میں معمول پر آئی جب دونوں ملکوں کے درمیان یہ مفاہمت ہو گئی کہ افغانستان اور روس کے مابین شمال میں سرحد کا تعین کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں ۱۸۹۵ء میں پامیر باونڈری کا فیصلہ ہو گیا۔ جس سے شمال میں افغانستان اور روس کی سرحدوں کا تعین ہو گیا۔

گویا افغانستان میں روس کی دلچسپی ایک تو گرم پانیوں کے بندرگاہ کی تلاش تھی اور دوسرے شمالی سرحدوں کا عدم تعین جس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے درمیان کشمکش شروع ہو جاتی تھی۔

جنگِ عظیم اوّل سے قبل دونوں ممالک یعنی برطانیہ اور روس، افغانستان کی سرزمین سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا دونوں نے یہ طے کیا کہ ایران اور افغانستان کو معاشی اعتبار سے دو حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ۱۹۰۷ء میں ماسکو میں ایک کنونیشن بھی منعقد ہوا۔ افغانستان کے امیر حبیب اللہ نے اس کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کیا جس کی وجہ سے یہ کنونیشن بے اثر ہو کر رہ گیا۔

علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ افغانستان اپنی جغرافیائی اہمیت کے سبب بڑی طاقتوں کے درمیان رقابت کا نشانہ بن رہا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اس زخم کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اس کا علاج بھی بتاتے ہیں۔

حقیقت ازلی ہے رقابتِ اقوام

نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تو
خودی میں ڈوب، زمانے سے نا اُمید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفو
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو تیرے دل میں لا الہٰ الاّ ہو

علامہ اقبال افغانیوں کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ افغان اپنی ان کمزوریوں پر قابو پالیں تاکہ آنے والے سخت تر حالات کا مقابلہ کرنے کے لائق ہوسکیں۔

یہ نکتہ خوب کہا شاہ سوری نے
کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری
عزیز ہے انہیں نام وزیری و محسود
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری
ہزار پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زنّاری
وہی حرم ہے، وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری

وہ محراب گل افغاں کی زبانی کبھی یہ پیغام دیتے ہیں اور کبھی پشتو شاعر خوش حال خان خٹک کے ذریعے۔ بالِ جبرئیل کی نظم ''خوش حال خان کی وصیت'' اگرچہ ایک مختصر نظم ہے لیکن اقبال نے اس میں بھی افغانوں کی شجاعانہ کردار کی ترجمانی کے ساتھ بڑے جامع انداز میں انہیں خودداری کا درس دیا ہے۔

قبائل ہوں ملّت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کم تر نہیں
قہستاں کا یہ بچۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوش حال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

(بالِ جبرئیل: خوش حال خاں کی وصیت)

علامہ اقبال کی شاعری کا بڑا حصّہ افغانستان کا حوالہ رکھتا ہے۔غیور اور آزاد افغان حکمران ان کی امیدوں کا مرکز تھے۔چار افغان حکمران علامہ اقبال کے ہمعصر تھے۔

۱۔ امیر حبیب اللہ خان (۱۹۰۱ء–۱۹۲۱ء)
۲۔ امیر امان اللہ خان (۱۹۱۹ء–۱۹۲۹ء)
۳۔ نادر خان (۱۹۲۹ء–۱۹۳۳ء)
۴۔ ظاہر شاہ (۱۹۳۳ء–۱۹۷۳ء)

اقبال کے اردو کلام سے زیادہ فارسی کلام میں ان حکمرانوں کے بارے میں، یا ان کے حوالے سے اشعار کہے گئے ہیں۔پیامِ مشرق کا انتساب بھی امیر امان اللہ خان کے نام ہے اور اس انتساب کے حوالے سے ''پیش کش'' کے نام سے ایک طویل نظم امیر امان اللہ خان کی خدمت میں نذر کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ایک پوری مثنوی ''مسافر'' افغانستان کی سیر کے حوالے سے لکھی گئی جس میں مشاہیرِ افغانستان کا تذکرہ بھی ہے اور بعض مقاماتِ سرزمینِ افغانیان کا بھی۔

وہ عبید اللہ سندھی کی طرح یہ نہیں چاہتے تھے کہ افغانستان، ہندوستان پر حملہ آور ہویا

افغانستان و ہندوستان کے مسلمان مل کر کوئی مشترک ریاست قائم کریں بلکہ افغانیوں کو ایک جفاکش اور سخت کوش قوم پا کر، ان سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ ان سے جہالت، تعصب اور بے عملی کو دور کر کے انہیں عہدِ حاضر کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے اہل بنا دیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اقبال کے کلام کو خصوصاً فارسی شاعری کو اگر کسی بیرونی ملک نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا تھا تو سب سے پہلے وہ افغانستان تھا۔ ایک بار انہیں شاہی مہمان کی حیثیت سے بلا کر افغانیوں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس قدر عزت افزائی سے اقبال کا متاثر ہونا فطری تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی فارسی غزلوں اور نظموں کے پہلے مجموعے پیامِ مشرق کو امیر افغانستان امان اللہ خان سے منسوب کیا۔ امان اللہ خان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں افغانستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی دلائی تھی۔ ۶ افغانوں کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس قوم کی خودی کہساروں میں خوابیدہ ہے اور اس خودی کو مہذب بنانے کی ضرورت ہے:

قسمت خود از جہاں نایافتہ
کوکبِ تقدیرِ او ناتافتہ
در قہستاں خلوتے ورزیدۂ
رستخیزِ زندگی نادیدۂ
جان تو بر محنتِ پیہم صبور
کوش در تہذیبِ افغانِ غیور

(پیام مشرق)

کہیں اس کے خطرات کا اظہار ہے کہ:

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لائق وہ جواں
جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش
مجھ کو ڈر ہے کہ ہے طفلانہ طبیعت تیری

اور عیار ہیں یورپ کے شکر پارہ فروش

(ضربِ کلیم)

کرسکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا؟
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

(ضرب کلیم)

اور کہیں قبائلی امتیازات کی خوبیوں کی طرف اشارہ ہے اور افغانوں کو متحد رہنے کی تلقین اور ان کے کردار کی تحسین ہے:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

(ضرب کلیم)

حوالہ جات

۱۔ دائرہ معارف اقبال، ج ا، ص ۳۵۱

۲۔ ہاشمی، رفیع الدین، علامہ اقبال شخصیت اور فکر و فن، ص ۲۱۰ (اقبال اکادمی، لاہور ۲۰۱۰ء)

۳۔ مقالات اقبال، ص ۲۷۰، مرتبہ: عبدالواحد معینی، سید (شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء)

۴۔ محمد اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۲۹۔۲۳۱ (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۶ء)

۵۔ ایران کا بادشاہ نادر شاہ افشار (۱۷۳۶ء۔۱۷۴۷ء) تھا۔۱۶۸۸ء میں شمالی خراسان میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق افشار قبیلے سے تھا اور اس کے والد کا نام امام قلی تھا۔ مقامی طور پر طاقت حاصل کرنے کے بعد نادر شاہ افشار نے ۱۷۲۲ء میں اصفہان فتح کر لیا، افغانوں کو ملک بدر کیا، اس نے ہرات اور انڈیا پر بھی حملے کیے۔ انڈیا میں اس نے مغل فوج کو دہلی کے قریب ۱۷۳۹ء میں شکست دی اور دہلی میں سخت لوٹ مار کر کے اُسے تاراج کیا۔

افغانستان کا احمد شاہ ابدالی، اسی نادر شاہ افشار کی فوج کا کماندار تھا، جب افغانوں کو ایران سے نکالا گیا تو احمد شاہ ابدالی بھی قندھار میں آباد ہوا۔ نادر شاہ افشار کے قتل کے بعد اُس نے اقتدار حاصل کیا اور افغانستان میں پہلی فوجی حکومت قائم کی (ہسٹاریکل ڈکشنری آف افغانستان، ص۱۷۲)

۶۔ دائرہ معارف اقبال، ج۳، ص۹

باب چہارم

دُرِّ دُرّان احمد شاہ ابدالی

مرد ابدالی وجودش آیتے
داد افغان را اساس ملّتے

(جاوید نامہ)

(یہ احمد شاہ ابدالی ہے جس کا وجود عظمت کا نشان ہے اس نے
افغانیوں کو ایک ملت کی بنیاد سے آگاہ کیا۔)

افغانستان کی تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کو ملت افغان کا موسس مانا جاتا ہے اور اسی حوالے سے اُسے ''بابا'' کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ احمد شاہ ابدالی ہرات کے گورنر محمد زمان خان کا بیٹا تھا، جس کا تعلق افغانستان کے سدّوزئی قبیلے سے تھا۔ یہ قبیلہ افغانستان کا بااثر ترین خاندان تھا۔ احمد خان ۱۷۲۲ء میں ملتان میں پیدا ہوا۔ ملتان میں آج بھی ایک شاہراہ ''ابدالی روڈ'' اسی مناسبت سے کہلاتی ہے۔ ابھی اس کی عمر سولہ برس ہی تھی جب ایرانی بادشاہ نادر شاہ افشار نے اسے اپنے ذاتی محافظوں کے دستے کا سپہ سالار مقرر کیا۔ ۱۷۴۷ء میں جب نادر شاہ افشار خراسان میں قتل کر دیا گیا تو احمد خان نے مختلف قبائل کی رضامندی سے اپنی بادشاہت کا اعلان

کیا۔قندھار میں اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی اور اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔اس طرح وہ ملّت افغان کا موسس اور افغانستان کا پہلا حکمران بنا۔

احمد شاہ پچیس سال کی عمر میں حکمران منتخب ہوا اور تقریباً رُبع صدی تک (۱۷۴۷ء تا ۱۷۷۳ء) افغانستان پر حکومت کی۔اس نے قندھار کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور ''دُرِّ دُرّان'' کا لقب اختیار کیا، لہٰذا اسے احمد شاہ درّانی بھی کہتے ہیں۔احمد شاہ نے اپنی سلطنت کو فتوحات کے ذریعے وسیع کیا۔اس کی سلطنت میں کشمیر، سندھ اور مغربی پنجاب کے علاقے بھی شامل تھے۔اس کی سلطنت کی حدیں ایک طرف مشرقی ایران سے شمالی ہندوستان تک اور دوسری طرف آمو دریا سے بحرِ ہند تک وسیع تھی۔[۱]

وہ کئی اعتبار سے اپنے عہد کے نہایت ہی ممتاز حکمرانوں میں سے تھا۔اس کی صلاحیت جہانبانی، تدبر اور عسکری لیاقت کا اعتراف اس کے مخالفین تک نے کیا ہے۔اس نے زیر تسلّط علاقے کو جو اس وقت چھوٹی چھوٹی منتشر ریاستوں پر مشتمل تھا، ایک مضبوط سیاسی سانچے میں ڈھال لیا اور افغانستان کو متشکل کیا۔

احمد شاہ ابدالی کے اہم سیاسی معرکوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس نے خراسان کا مشرقی حصّہ ایران سے منقطع کر کے افغانستان کی ایک مستقل مملکت تشکیل دی۔اس وقت ایران، صفویوں کے زیر اقتدار تھا۔جن کا مذہبی تشدّد سوادِ اعظم کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔اس موقع پر ابدالی نے اپنی سیاسی بصیرت اور عسکری صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے ایران سے اپنا علاقہ الگ کر لیا اور اسے پنجاب، سندھ اور کشمیر کے ساتھ ملحق کر دیا۔

احمد شاہ ابدالی کی دوسری اہم سیاسی کاروائی یہ تھی کہ جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت انحطاط پذیر ہوئی تو اس سیاسی انتشار کے نتیجے میں مرہٹوں نے بڑی قوت حاصل کر لی اور اس مرہٹہ گردی سے دارالحکومت دہلی بھی خطرے میں آ گیا۔اس موقع پر شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ کو ہندوستان آنے اور مرہٹوں کی طاقت کچلنے کے لیے خط لکھا۔احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کی جنگ ہوئی، جس میں مرہٹوں کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ابدالی کا یہ اقدام سلطنت مغلیہ کے

زوال کو روک تو نہ سکا تاہم اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جانے سے ضرور رک گیا۔ابدالی نے دہلی کے تاج وتخت پر قبضہ نہ کیا مگر جاتے ہوئے پنجاب، سندھ اور کشمیر کا الحاق اپنی سلطنت سے کرلیا۔

احمد شاہ ابدالی سے علامہ اقبال کو ایک گونہ عقیدت تھی ۔ چنانچہ سفرِ افغانستان کے دوران علامہ اقبال، احمد شاہ ابدالی کے مزار پر بھی گئے ۔اقبال نے اس واقعہ کو ''برمزار احمد شاہ ابدالی بابا موسئس ملت افغانیہ'' کے عنوان سے مثنوی مسافر میں درج کیا ہے۔اس میں علامہ اقبال نے احمد شاہ ابدالی کی شخصیت اور اس کی فتوحات کا ذکر کیا ہے اور احمد شاہ ابدالی کو محمد فاتح کا ہم پلّہ قرار دیا ہے کہ دونوں صف شکن، شمشیرزن اور صاحبِ سخن تھے۔

احمد شاہ ایک غیر متعصب اور وسیع النظر شخص تھا۔خود نہایت پابند شرع تھا۔علامہ اقبال احمد شاہ کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ جاوید نامہ کے اختتام پر علامہ اقبال نے نادر، ابدالی اور سلطان شہید (یعنی ٹیپو سلطان) کے بارے میں بعض اہم واقعات بیان کیے ہیں۔یہ گویا احمد شاہ ابدالی اور زندہ رود (اقبال) کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔جس میں اقبال، ابدالی کے سوالات کے جواب دیتے ہیں اور اس میں افغان، افغانستان اور ان کی تاریخ وتہذیب کے حوالے سے بڑے بامعنی نکات سامنے لاتے ہیں۔

ابدالی سوال کرتے ہیں:

آں جواں کو سلطنت ہا آفرید باز در کوه و قفار خود رمید!

آتشے در کوه سارش بر فروخت خوش عیار آمد بروں یا پاک سوخت؟

(ترجمہ: وہ افغان جوان جس نے کئی سلطنتیں پیدا کیں، پھر وہ پہاڑوں اور بے آب وگیاہ بیابانوں کی طرف واپس چلا گیا۔اس نے اپنے پہاڑوں میں آگ بھڑکائی تھی، تو (زندہ رود) مجھے یہ بتا کہ اس میں سے وہ زمانے کے معیار پر پورا اتر کر باہر آیا ہے یا اسی میں جل کر رہ گیا ہے۔)

(''آں جواں'' سے مراد امان اللہ خان ہے۔)

زندہ رود جواب میں کہتا ہے:

امتاں اندر اخوت گرم خیز — او برادر با برادر در ستیز
از حیات و حیاتِ خاور است — طفلک ده ساله اش لشکر گر است!
بے خبر خود راز خود پرداختہ — ممکنات خویش را نشناختہ!
ہست دار اے دل و غافل ز دل — تن ز تن اندر فراق و دل زوال!
مرد رہرو را بمنزل راہ نیست — از مقاصد جان او آگاہ نیست!
خوش سرود آں شاعر افغاں شناس — آنکہ بیند، باز گوید بے ہراس!
آں حکیم ملت افغانیاں — آں طبیب علت افغانیاں!
راز قومے دید و بے باکانہ گفت — حرف حق با شوخی رندانہ گفت!
"اشترے یابد اگر افغان حر — با یراق و ساز و با انبار در
ہمت دونش ازاں انبار در — می شود خوشنود با زنگ شتر"!

ترجمہ:

- ☆ دنیا کی دوسری قومیں بھائی چارے میں سرگرم ہیں جبکہ افغانی بھائی، اپنے بھائی سے لڑ رہا ہے۔
- ☆ ان کی زندگی ہی سے مشرق کی زندگی ہے، اس کا تو دس سالہ بچہ بھی لشکر کی قیادت کرسکتا ہے۔
- ☆ خود سے بے خبر افغانیوں نے خود کو کھو دیا ہے، اس نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا ہی نہیں۔
- ☆ وہ صاحب دل تو ہے لیکن دل سے غافل ہے۔ گویا افغانیوں کے جسم، جسم سے اور دل دل سے جدا ہیں۔ (یعنی نفاق کا شکار ہیں۔)
- ☆ اس مسافر کو منزل تک راستہ نہیں ملتا، وہ اپنی زندگی کے مقصد سے آگاہ ہی نہیں۔
- ☆ وہ افغان شناس شاعر جو کچھ دیکھتا ہے وہ بے خوف وخطر کہہ ڈالتا ہے۔ (یہاں افغان شناس شاعر سے مراد، خوش حال خان خٹک ہیں)

☆ وہ (خٹک) افغانی قوم کا حکیم (دانش مند) بھی ہے اور ان کی بیماریوں کا معالج بھی۔

☆ اس (خٹک) نے قوم کا راز دیکھا اور اسے بے باکی کے ساتھ بیان کر دیا۔ اس نے سچی بات، رندانہ شوخی سے کہہ ڈالی۔

☆ (وہ بات یہ ہے کہ) ''اگر ایک آزاد افغان کو کوئی اونٹ مل جائے۔ جس پر قیمتی ساز و سامان اور موتیوں کا ڈھیر ہو۔

☆ تو اس کی پست ہمتی کچھ ایسی ہے کہ وہ موتیوں کے اس ڈھیر میں سے اونٹ کی گھنٹی ہی سے خوش ہو جائے گا۔''

اس کے بعد پھر بزبان ابدالی، اقبال کہتے ہیں:

درنہاد ماتب و تاب از دل است	خاک را بیداری و خواب ز ز دل است!
تن زمرگ دل دگرگوں می شود	درمسا ماتش عرق خوں می شود!
از فساد دل بدن ہیچ است ہیچ	دیدہ بردل بندو جز بردل مپیچ!
آسیا یک پیکر آب و گل است	ملت افغاں درآں پیکر دل است!
از فساد او فساد آسیا	در کشاد او کشاد آسیا
تا دل آزاد است آزاد است تن	ورنہ کاہے در رہ باد است تن!
ہمچو تن پابند آئین است دل	مردہ از کیں زندہ از دین است دل!
قوت دیں از مقام وحدت است	وحدت از مشہود گردد ملت است

ترجمہ:

☆ ہماری فطرت میں جو تب و تاب ہے وہ دل کی وجہ سے ہے۔ انسانی جسم کی نیند یا بیداری بھی دل کی نیند یا بیداری ہی کی وجہ سے ہے۔

☆ دل کی موت سے، جسم کی حالت بدل جاتی ہے، اس کے مسامات میں پسینہ، خون بن جاتا ہے۔

☆ دل کے بگاڑ کے باعث جسم بے کار ہے، بے کار ہے۔ لہٰذا تو اپنی آنکھیں دل پر

جما (یعنی تمام توجہ دل کی طرف کر)۔

☆ ایشیا مٹی اور پانی کا ایک جسم ہے۔ اور ملت افغان اس جسم میں ایک دل ہے۔

☆ اس قوم کا بگاڑ، ایشیا کا بگاڑ ہے۔ اور اس کی خوشحالی، ایشیا کی خوشحالی ہے۔

☆ جب تک دل آزاد ہے، جسم بھی آزاد رہے گا۔ ورنہ جسم کی حیثیت اس تنکے کی مانند ہے جو ہوا کے راستے میں پڑا ہے۔

☆ جسم کی طرح، دل بھی آئین کا پابند ہے۔ بغض وکینہ سے دل مرجاتا ہے اور دین سے دل زندہ ہوتا ہے۔

☆ دین کی قوت مقامِ وحدت سے ہے۔ اگر وحدت وجود میں آجائے تو وہ ملت بن جاتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال افغانستان گئے تو ابدالی کے مزار پر حاضر ہوئے۔ وہاں ایک نظم کہی جس کا عنوان ہے ''برمزار حضرت احمد شاہ ابدالی بابا علیہ الرحمہ موسس ملت افغانیہ'' کے مزار پر ابدالی کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا:

''یہ روشن ضمیر بادشاہ کی قبر ہے جس کے باطن سے ایک ملت کا ظہور ہوا۔ آسمان اس کی قبر کے گنبد کو حرم کی طرح مقدس گردانتا ہے۔ اس گنبد کے طواف سے سورج کی پیشانی چمکتی ہے۔ اس مجاہد بادشاہ نے اقلیم سخن میں بھی اپنا سکہ رائج کیا اور ملت کو ذوق تجسس عطا کیا۔ فرشتے اس کی قبر پر تسبیح خوانی کرتے ہیں۔ اس کے دست ودل اس قدر فیاض اور بے نیاز تھے کہ اس نے کئی سلطنتیں حاصل کیں مگر انہیں واپس دے دیا۔ وہ نکتہ سنج تھا، عارف اور شمشیر زن تھا۔''[۲]

حوالہ جات

۱۔ *Historical Dictionary of Afghanistan*, P.24.

۲۔ دائرہ معارف اقبال، ج ا، ص ۲۰۰

باب پنجم

امان اللہ خان اور اقبال کا خراجِ عقیدت

اے امیر کامگار اے شہر یار
نوجوان ومثلِ پیراں پختہ کار
چشمِ تو از پردگیہا محرم است
دل میانِ سینہ ات جامِ جم است

(اے بلند اقبال سردار، اے بادشاہ، نوجوان مگر بوڑھوں کی طرح جہاں دیدہ۔
تیری آنکھ چھپی ہوئی چیزوں کی رازداں ہے۔ تیرے سینے میں دل گویا جمشید
کا پیالہ ہے۔)

جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو افغانستان پر امیر حبیب اللہ حکمران تھا۔ (۳؍ اکتوبر ۱۹۰۱ء-۲۰؍فروری ۱۹۱۹ء)۔ امیر حبیب اللہ ایک طاقتور حکمران تھا۔ جس نے برطانیہ سے آبرومندانہ معاہدہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، اسی کے بعد افغانستان سے برطانوی فوجی واپس چلے گئے تھے اور امیر حبیب اللہ نے افغانستان کو برطانوی تسلّط سے نکال لیا تھا۔

اسی کے دَور میں افغانستان دورِ جدید میں داخل ہوا۔ اس کی سخت حکمتِ عملی کی وجہ سے ۱۹۰۷ء کا ہونے والا کنوینشن بے نتیجہ ثابت ہوا اور افغانستان روس اور برطانیہ کے حلقۂ

ہائے اثر میں آنے سے محفوظ رہا۔

۱۹۱۷ء میں جب زار روس کی شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد نئی بالشویک حکومت کا قیام عمل میں آیا تو روس کی طرف سے افغانستان کو جو خطرہ لگا رہتا تھا عارضی طور پر ختم ہو گیا کیونکہ بالشوازم ایک بین الاقوامی تحریک تھی جس کا مقصد ہی شہنشاہیت اور توسیع مملکت یعنی استعماریت کا خاتمہ اور نظریاتی انقلاب لانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں لینن نے پولینڈ کو اس کے مطالبے سے زیادہ علاقہ دے دیا۔ اُس نے فن لینڈ اور دوسری بالٹیک (Baltic) ریاستوں کی آزادی خوشی سے تسلیم کی اور افغانستان کے ساتھ بھی مراعات برتی۔ ایران کو اس کے غصب کردہ حقوق واپس کر دیے۔ ترکی کو دوست بنایا، یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ بالشویک انقلاب کے بعد آنے والی کمیونسٹ حکومت کے سامنے استعماریت اور ہوس ملک گیری کا حصّہ نہیں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جلد ہی اس کمیونسٹ تحریک میں بھی نسلی برتری اور تفوق کے جذبات پرورش پانے لگے اور اس کے زیر اثر بڑی خوں ریز جنگیں بھی ہوئیں۔ تاہم انقلاب روس ۱۹۱۷ء کے فوراً بعد افغانستان کو روس سے جو خطرات تھے وہ کچھ عرصے کے لیے ضرور ٹل گئے تھے۔

۱۹۱۹ء کا سال افغانستان کے لیے انتہائی ہنگامہ خیز سال ثابت ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی برطانیہ نے افغانستان پر نئے سرے سے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے جدّ وجہد شروع کر دی۔ برطانیہ کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ امیر حبیب اللہ تھا، لہٰذا حبیب اللہ کو ایک سازش کے تحت ۲۰ر فروری ۱۹۱۹ء کو قتل کر دیا گیا۔

امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد اس کے بھائی نصر اللہ خان نے جلال آباد میں اپنی امارت کا اعلان کیا تو امیر کے تیسرے بیٹے امان اللہ نے فوج کی مدد سے اس کو گرفتار کر لیا اور خود مسند اقتدار پر متمکن ہو گیا۔ اُس نے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد ہی افغانستان سے انگریزوں کے اثرات کو پوری طرح ختم کرنے کے عزم کا اعادہ کیا اور تمام فوج اور سرداروں کو جمع کر کے ایک نہایت پُر اثر تقریر کی۔ تقریر کے دوران اپنے والد کے قتل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنی تلوار کو بے نیام کرتے ہوئے کہا:

''جب تک باپ کے قاتل کو سزا اور افغانستان کو انگریزی اثر سے آزاد نہ کرلوں گا
یہ تلوار نیام میں نہیں ڈالوں گا۔''

چنانچہ امان اللہ خان نے تخت نشین ہوتے ہی افغانستان کے استقلال کا اعلان کر کے برطانوی حکومت سے جنگ شروع کردی۔ ۳رمئی ۱۹۱۹ء میں تیسری افغان۔ برٹش جنگ شروع ہوئی۔ انگریزی افواج نے درۂ خیبر کے شمالی دہانے کے پاس ڈکہ کے مقام پر اور چمن کے قریب اسپین بولدک کے افغانی قلعہ پر قبضہ کرلیا اور کابل پر طیاروں کی مدد سے بم باری کی۔ لیکن افغانستان کے عوام نے قندھار میں سردار عبدالقدوس، صدر اعظم، جنوبی سرحدات پر سپہ سالار محمد نادر خان اور مشرقی سمت میں اپنے قومی سرداروں کی سربراہی میں برطانوی افواج کا مقابلہ کیا۔

جولائی ۱۹۱۹ء میں سوویت روس نے افغانستان کا استقلال تسلیم کرلیا۔ بالآخر حکومتِ افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان صلح کی گفت وشنید شروع کی اور معاہدہ ٔ راولپنڈی (۸راگست ۱۹۱۹ء) کی رُو سے برطانوی حکومت نے افغانستان کی آزادی باضابطہ تسلیم کرلی۔

اس کامیابی نے امان اللہ خان کو قومی ہیرو بنادیا۔ اُس نے اپنی توجہ ملک کی ترقی کی طرف لگادی وہ اصلاحات کے ذریعے ملک کو جدید بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے سفیروں کے ذریعے ساری دنیا سے روابط قائم کرلیے۔ اُس نے ملک میں ایسے اسکول قائم کیے جہاں فرنچ، جرمن اور انگلش زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں روس کی سوویت حکومت اور برطانیہ سے نئے معاہدے کیے گئے۔

۱۹۲۲ء میں لوئی جرگہ (قومی نمائندگان) نے ایک دستور اساسی مرتب کیا جس میں تمام افغانوں کو انفرادی آزادی اور یکساں حقوق دیے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں امان اللہ خان نے ایک نیا دارالحکومت ''دارالآمان'' کے نام سے قائم کیا جہاں پارلیمنٹ اور دوسری سرکاری عمارتیں اور اہم افغان امرا کے مکانات بنائے گئے۔

اُس نے معاشرتی اصلاحات نافذ کرتے ہوئے کابل میں خواتین کو بے نقاب باہر نکلنے کی اجازت دی۔ مردوں کو بھی یورپی لباس پہننے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہ وہی وقت تھا جب

ایران میں رضا شاہ پہلوی اور ترکی میں مصطفےٰ کمال اپنے اپنے ممالک کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے اصلاحات نافذ کر رہے تھے۔

داخلی اصلاحات کے حوالے سے امان اللہ خان کے زمانے میں ہونے والے اہم اقدامات میں غلامی کی تنسیخ، مطابع (Press) کا قیام، اخبارات کا اجرا، بلدیات کا قیام، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، تار برقی اور ٹیلی فون کی توسیع، نہروں اور کانوں کی کھدائی، کابل میں مجلسِ شوریٰ اور صوبوں میں مجالس مشورہ کا قیام، سیاسی افراد کی آزادی، جہالت اور تعصب کے خلاف جدّ و جہد، اعلیٰ تعلیم کے انتظام، حمل و نقل کے جدید وسائل کا آغاز شامل ہیں۔۱۹۲۴ء میں عورتوں کے لیے بھی اعلیٰ تعلیم کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ جس پر انگریزوں کے اشارے سے ایک مفرور افغانی سردار عبدالکریم کی زیرِ قیادت خوست میں بغاوت ہوگئی۔ کابل کے عساکر نے باغیوں کو گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا اور عبدالکریم ہندوستان کی طرف بھاگ گیا یہ پہلی رجعت پسندانہ تحریک تھی جو انگریزوں کی شہ پر امان اللہ کے خلاف پیدا کی گئی۔

تاہم ۱۹۲۴ء میں دوسرے لوئی جرگہ نے تعلیم نسواں سے متعلق قوانین منسوخ کر دیے۔ نیز جبری بھرتی کے قوانین میں بھی ترمیم کر دی۔

لوئی جرگہ کو افغانستانی حکومت کی انتہائی طاقتور قومی نمائندوں کی مجلس کہا جا سکتا ہے۔ افغان حکمران ان کے مشورے سے قومی نوعیت کے اہم معاملات طے کرتے تھے۔ سب سے پہلا جرگہ میر واعظ (۱۵-۱۷۰۹ء) کے زمانے میں منعقد ہوا تھا۔ اسی طرح سے احمد شاہ ابدالی کی مسند نشینی کی توثیق بھی اس وقت کے لوئی جرگہ نے کی تھی۔ اسی طرح امان اللہ کے زمانے میں بھی اور اس کے بیٹے ظاہر شاہ کے زمانے میں بھی لوئی جرگے نے اساسی دستور منظور کیا تھا اور امان اللہ کو بعض اصلاحات (مثلاً خواتین کی اعلیٰ تعلیم اور جبری بھرتی) واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ گویا یہ جرگہ سیاسی اعتبار سے ریاست کا طاقتور عنصر رہا ہے۔

بہر حال بغاوت کے خاتمے کے بعد جب امن قائم ہو گیا تو امان اللہ نے ۱۹۲۶ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور ۱۹۲۸ء میں یورپی ملکوں کی سیاحت کی۔ ان سے سیاسی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی معاہدات طے کیے اور کاغذ سازی، شکر سازی، پشمینہ بافی اور نساجی (کپڑا بننے) کے کارخانے خرید کر ملک میں لایا۔

اس دورے سے واپس آ کر بادشاہ نے نئے دستور اساسی کے نفاذ اور معاشرتی اور تعلیمی اصلاحات کی ترتیب کے لیے تیسرا لوئی جرگہ طلب کیا۔ چونکہ امان اللہ کا ماسکو جانا برطانیہ کے سیاسی مفادات کے خلاف تھا اور اسے ہندوستان کے لیے خطرے کی علامت سمجھا گیا، اس لیے انگریزی حکومت نے ہندوستان کے سرحدی قبائل میں شورش برپا کر دی۔ اس کے علاوہ اسی حکومت کی شہ پر ایک تاجیک ڈاکو جو ''بچۂ سقہ'' کے نام سے مشہور تھا، نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ (جنوری ۱۹۲۹ء) امان اللہ خان قندھار کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے اس نے کابل کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے جو کوشش کی اُسے حبیب اللہ (بچۂ سقہ) کے حامیوں نے ناکام بنا دیا۔ اسی دوران ایک اور تاجیک عبدالرحیم کا ہرات پر قبضہ ہو گیا۔ امان اللہ چمن کے راستے افغانستان سے رخصت ہو گیا اور اٹلی جا کر سکونت اختیار کر لی۔ اس کا انتقال ۲۶ راپریل ۱۹۶۰ء میں اٹلی میں ہوا اُسے جلال آباد میں، امیر حبیب اللہ کے پہلو میں دفنایا گیا۔

علامہ اقبال، امیر امان اللہ خان، فرمانروائے افغانستان سے بہت پُر امید تھے۔ انہوں نے پیامِ مشرق کا انتساب امیر امان اللہ سے کرتے ہوئے ''پیشکش'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی اور ان کی نذر کی۔ جس کے آغاز میں وہ کہتے ہیں:

اے امیر کامگار اے شہر یار
نوجوان و مثلِ پیراں پختہ کار

چشم تو از پردگیہا محرم است
دل میانِ سینہ ات جامِ جم است

(ترجمہ: اے بلند اقبال سردار، اے بادشاہ، نوجوان مگر بوڑھوں کی طرح جہاں دیدہ۔ تیری آنکھ چھپی ہوئی چیزوں کی رازداں ہے۔ تیرے سینے میں دل گویا جمشید کا پیالہ ہے۔)

عزمِ تو پایندہ چوں کہسارِ تو
حزمِ تو آساں کند دشوارِ تو

ہمتِ تو چوں خیالِ من بلند
ملّتِ صد پارہ را شیرازہ بند

(ترجمہ: تیرا عزم تیرے پہاڑوں کی طرح اٹل۔ تیری سوجھ بوجھ تیری مشکل آسان کرتی ہے۔ تیری ہمت میرے تخیل کی طرح بلند۔ تتر بتر ملّت کو اکھٹا کرنے والی۔)

ھدیہ از شاھنشاں داری بسی
لعل و یاقوتِ گراں داری بسی

اے امیر ابنِ امیر ابنِ امیر
ھدیہ از بے نوائے ھم پذیر

(ترجمہ: بڑے بڑے بادشاہوں نے تجھے نذریں گزاریں ہیں۔ تو بہت سے انمول ہیرے موتی رکھتا ہے۔ اے جدّی پشتی سلطان۔ ایک فقیر کی ناچیز نذر بھی قبول کر۔)

یہ نظم ۱۸۱، اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں اقبال نے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ کو عصرِ جدید میں، جبکہ مسلمان یورپی استعماریت کے غلام تھے، ایک ایسے مسلمان حکمران کے طور پر پیش کیا ہے جسے مثالی قرار دیا جا سکتا ہے اور اسے اسلامی روایات کا امین قرار دیا ہے۔ وہ امیر امان اللہ سے کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سلف کی روح پھونک دے اور افغان، جو ایک ناتراشیدہ ہیرا ہیں، انہیں تراش خراش کر ایک عظیم قوم بنا دے۔

در مسلماں شانِ محبوبی نماند

خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند

اے ترا فطرت ضمیرِ پاک داد
از غمِ دیں سینۂ صد چاک داد

(ترجمہ: مسلمانوں میں شانِ محبوبی نہ رہی۔ خالدؓ اور فاروقؓ اور صلاح الدین ایوبیؒ (کے اوصاف) نہ رہے۔ اے کہ قدرت نے تجھے پاک دل بخشا۔ دین کے غم سے چاک چاک سینہ عطا کیا۔)

تازہ کن آئینِ صدیقؓ و عمرؓ
چوں صبا بر لالۂ صحرا گذر

ملّت آوارۂ کوہ و دمن
در رگِ او خونِ شیراں موج زن

(ترجمہ: صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کا چلن تازہ کر۔ صبا کی طرح لالۂ صحرا پر سے گذر۔ کوہ و دمن میں بکھری ہوئی افغان قوم۔ جس کی رگوں میں شیروں کا خون ٹھاٹھیں مارتا ہے۔)

زیرک و روئیں تنِ و روشن جبیں
چشمِ او چوں جرہ بازاں تیز بیں

قسمتِ خود از جہاں نایافتہ
کوکبِ تقدیرِ او نا تافتہ

(ترجمہ: ہوشیار اور فولاد بدن اور روشن جبیں۔ اس کی آنکھ سفید شہبازوں کی طرح تیز ہیں۔ اس نے دنیا سے اپنا حصّہ نہیں پایا۔ اس کی قسمت کا ستارہ نہیں چمکا۔)

در قہستاں خلوتے ورزیدۂ
رستخیزِ زندگی نادیدۂ

جانِ تو بر محنتِ پیہم صبور

کوش در تہذیبِ افغانِ غیور

(ترجمہ: پہاڑوں میں گوشہ گیر۔زندگی کے ہنگاموں سے انجان۔تیری جان لگا تار محنت کی سہار رکھتی ہے۔غیرت مند افغانوں کی تراش خراش میں کوشش کر۔)

باب ششم

نادر شاہ: اقبال کی اُمیدوں کا استعارہ

نادرِ افغاں شہِ درویش خو
رحمت حق بر روانِ پاک او
کارِ ملت محکم از تدبیر او
حافظِ دین مبیں شمشیر او

(شاہ افغانستان، نادر خان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھا۔ اس کی تدبیر سے امورِ ملت مستحکم ہوئے اور اس نے اپنی قوتِ اقتدار سے دین کی حفاظت کی۔)

افغانستان کا بادشاہ نادر خان، علامہ اقبال کا ہمعصر تھا۔ نادر خان ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا، یہ سردار محمد یوسف خان کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز فوجی ملازمت سے کیا اور ترقی کرتے ہوئے ۱۹۰۶ء میں بریگیڈئر کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ۱۹۱۲ء میں مینگل بغاوت کچلنے کی وجہ سے لیفٹنٹ جنرل (نائب سالار) بنا دیا گیا اور پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں (۱۹۱۴ء) جنرل (سپہ سالار) بنا دیا گیا۔ یہ غازی امیر امان اللہ خان کا دَورِ حکومت تھا۔ امیر امان اللہ نے اُسے ۱۹۱۹ء میں وزیرِ جنگ مقرر کیا جس پر وہ ۱۹۲۴ء تک خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد اس کے

امیر امان اللہ سے کچھ اختلافات ہوئے تو جنرل نادر خان کو سفیر بنا کر فرانس بھیج دیا گیا۔ جنرل محمد نادر خان کا خاندان، افغانستان کی سیاست میں بہت دخیل تھا، اس لیے جنرل نادر خان کو امور مملکت سے بے تعلق کرنے کی غرض سے فرانس میں سفیر نامزد کر دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد جنرل نادر خان کے دو بھائی سردار محمد ہاشم خان اور سردار شاہ ولی اللہ خان بھی فرانس پہنچ گئے۔ نادر خان نے خرابیٔ صحت کا عذر کرتے ہوئے سفارت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے بھائیوں سمیت فرانس میں مقیم رہے۔

افغانستان میں جب امیر امان اللہ خان کے خلاف حالات نے پلٹا کھایا (جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) اور ان حالات کی تاب نہ لا کر امان اللہ خان اپنے خاندان سمیت ۲۲ رجون ۱۹۲۷ء کو یورپ چلے گئے اور افغانستان پر ایک غیر معروف امیر حبیب اللہ المعروف بہ ''بچۂ سقہ'' کی حکومت قائم ہوگئی تو نادر خان نے حالات کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۵ رفروری ۱۹۲۹ء کو اپنے بھائیوں کے ساتھ نادر خان اچانک بمبئی (انڈیا) پہنچ گئے۔ وہاں سے پشاور پہنچے۔ انہوں نے یہ سفر ٹرین سے کیا۔ راستے میں مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر برعظیم کے مسلم زعما نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ لاہور اسٹیشن پر علامہ اقبال بھی نادر خان سے ملے۔ فقیر سید وحید الدین کہتے ہیں: ''ڈاکٹر صاحب تنگ دستی کے باوجود اپنی ساری پونجی کئی سو روپوں کی صورت میں لے کر نادر خان سے ملے اور کہا آپ جس نیک مقصد کے لیے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے روپے کی اشد ضرورت ہوگی اس لیے میرا یہ ہدیہ قبول فرمائیے۔ نادر خان اس پیش کش پر حیران رہ گیا[۱]

اس سے قبل علامہ اقبال کی نادر خان سے ایک ملاقات ۱۹۲۴ء میں ہو چکی تھی۔ جب پیرس جاتے ہوئے نادر خان لاہور کے بنڈ و ہوٹل میں ایک دن کے لیے ٹھہرے تھے۔ ان دنوں وہ پیرس (فرانس) میں افغانستان کے سفیر کے منصب پر فائز تھے۔

اس ملاقات میں نادر خان نے کلام اقبال کا ذکر کرتے ہوئے دلچسپ بات کہی: ''آپ نے جو کچھ لکھا ہے دنیا کی کوئی توپ اور بندوق اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایک ایک لفظ

ایک ایک بیٹری کا حکم رکھتا ہے۔'' ۲

یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ نادر خان کی والدہ لاہور میں پیدا ہوئی تھیں، اسی لیے نادر خان بخوبی اردو سمجھتے اور بولتے تھے۔ وہ ڈیرہ دون میں زیرِ تعلیم بھی رہے تھے۔ ۳

پشاور میں کچھ عرصہ قیام کے بعد نادر خان اچانک علی زئی (افغانستان کے سرحدی علاقے) پہنچ گئے اور وہاں انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرلیا۔ پشاور قیام کے دوران نادر خان کا علامہ اقبال سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رہتا تھا۔ جنرل نادر خان کا ایک خط جو ''انقلاب'' میں چھپ جانے کی وجہ سے محفوظ رہ گیا۔ ۹ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ / ۱۴ ستمبر ۱۹۲۹ء کو علامہ اقبال کے نام علی خیل سے لکھا گیا۔ اس سے علامہ اقبال کی کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط میں نادر خان لکھتے ہیں:

جناب فاضل محترم سر محمد اقبال صاحب

آپ نے اپنے ان عالی جذبات ہمدردانہ سے جو آپ افغانستان کی موجودہ تباہ حالی کے متعلق رکھتے ہیں، مجھے اور افغانستان کے عام بہی خواہوں اور فداکاروں کو ممنون و متشکر بنادیا ہے۔ افغانستان تباہی کے نزدیک ہے۔ اس بے چاری ملت کو بہت بڑے تہلکہ کا سامنا ہے۔ افغانستان اپنے ہندی بھائیوں کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ آپ ایسے وقت میں جو خیر خواہانہ قدم اٹھا رہے ہیں وہ ہمارے لیے ڈھارس کا موجب ہے۔ خصوصاً مالی امداد کا مسئلہ جس کے متعلق اخبار ''اصلاح'' کے ذریعے اپنے ہندی بھائیوں کے لیے شائع کر چکا ہوں، بہت حوصلہ افزا ہے۔ اُمید ہے کہ جناب فاضل محترم جو روحاً افغانستان کی موجودہ مصیبت میں شریک ہیں۔ اس موقع پر اپنی مساعی سے کام لے کر افغانستان کی رنج زدہ قوم کو ہمیشہ کے لیے ممنون فرمائیں گے۔

بااحترامات لائقہ محمد نادر خان ۴

علامہ اقبال کی کوششوں سے لاہور میں ''نادر خان ہلال احمر فنڈ'' قائم کیا گیا اور ۱۱ر

اکتوبر ۱۹۲۹ء کو علامہ اقبال نے قوم سے حسب ذیل اپیل کی:

برادر ملت و جوانان اسلام!

افغانستان کے حالات آپ کو معلوم ہیں۔اس وقت اسلام کی ہزار ہا مربع سرزمین اور لاکھوں فرزندان اسلام کی زندگی اور ہستی خطرے میں ہے اور ایک ہمدرد اور غیور ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانان ہند پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کو بادفنا کے آخری طمانچے سے بچانے کے لیے جس قدر دلیرانہ کوشش بھی ممکن ہو، کرگزریں۔

لاہور میں جنرل نادر خاں اور افغانستان کے زخمی سپاہیوں، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی امداد و اعانت کے لیے ''نادر خان ہلال احمر سوسائٹی'' قائم ہو چکی ہے۔ جس کا دفتر بالعموم صبح چھ بجے سے لے کر دس بجے شب تک برکت اسلامیہ ہال میں کھلا رہتا ہے۔

حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے انجمن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں لاہور اور ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کے لیے اپنی قوت و کوشش صرف کردے۔اس غرض کے لیے ایسے ایثار پیشہ کارکنوں کی ضرورت ہے جو رضا کارانہ حیثیت سے مقررہ وقت پر اور منظم طریق سے لاہور میں کام کریں۔

اس کے علاوہ دفتر کو تمام ملک سے خط و کتابت کرنا ہے۔ ہزاروں اپیلیں بھیجنی ہیں۔ سینکڑوں اخبارات اور ہر ایک شہر کے رؤسا، امرا اور اسلامی انجمنوں کو خطوط لکھنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر وسیع کام جو لاہور کے ہر ایک گلی کوچہ پر مسلط ہو اور دوسری طرف تمام ملکی اخبارات اور تمام اسلامی انجمنوں اور بستیوں پر محیط ہو، مستقل مزاج، سنجیدہ دردمند، ذی عزم اور باحساس کارکنوں کی امداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

جنرل نادر خان کی امداد کو اس کی حقیقی اہمیت کے مطابق وسعت دینے کے لیے ایسے جواں ہمت کارکنوں کی ضرورت ہے جو مقامی طور پر پبلک جلسوں کے انعقاد اور ملکی اخباروں، انجمنوں، قومی کارکنوں اور تمام فیاض اور ذی استطاعت اصحاب سے خط وکتاب کرنے میں انجمن کو امداد دیں۔

میں اپنے تمام سنجیدہ اور مخلص عزیزوں سے، جن کے دل میں اسلام کا درد ہے، جو آزاد متحدہ افغانستان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ان تمام مقامی انجمنوں کے اراکین سے جو "نادر خان ہلال احمر سوسائٹی" سے تعاون واشتراک کے لیے آمادہ ہوں، بڑے زور سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ برکت علی اسلامیہ ہال میں قریشی صاحب سے ملیں اور اپنے وقت کا کچھ حصّہ معمولی تفریح یا کم ضروری مشاغل سے بچا کر انجمن ہلال احمر کے کام میں صرف کریں اور یقین کریں کہ یہاں لاہور میں آپ کا ایسا کرنا خود افغانستان میں پہنچ کر جنرل نادر خان صاحب کی امداد کرنے کے مترادف ہوگا۔ محمد اقبال۔" [۵]

نادر خان کی سیاسی جدّ وجہد ابتدائی ناکامیوں کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ قبائلیوں خصوصاً وزیری قبائل کی مدد سے بالآخر وہ اس قابل ہوگیا کہ بچہ سقہ کو شکست دے کر کابل پر قابض ہوگیا۔ یہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ اس کے بعد لوئی جرگہ کے فیصلے کے مطابق اُسے افغانستان کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔

محمد نادر خان کا دَورِ حکومت چار سال رہا۔ (۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۹ء تا ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء) اس مختصر دَورِ حکومت میں ایک طرف نادر خان نے بعض قبائلی بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کیا تو دوسری طرف اصلاحات کا آغاز کیا۔ اُس نے تعلیمی اصلاحات پر خاصی توجہ دی۔ اس کے دَور میں وہ مدرسے اور مکتب بھی دوبارا کھولے گئے جو گزشتہ سال کی بدامنی اور شورش کی وجہ سے بند ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ دار الفنون کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی۔ ۱۹۳۲ء میں میڈیکل

کالج کھولا جو بعد میں کابل یونی ورسٹی کا کلیہ طبیہ بن گیا۔

۱۹۳۱ء میں ایک نیا دستور بنایا جس کے تحت ایک قومی اسمبلی (شورائی ملی) ایک سینٹ (مجلسِ اعیان) اور ایک مشاورتی کاونسل (جمعیۃ العلما) کا قیام عمل میں آیا اس قانون کے مطابق عوام کو شخصی آزادی اور جان، مال اور معاش کے تحفظ کی ضمانت دی گئی دستور میں یہ طے پایا گیا کہ بادشاہ (یعنی صدرِ مملکت) کابینہ کے توسط سے حکومت کرنے کا مجاز ہوگا۔ صدر ہی وزیراعظم کا انتخاب کرے گا۔ پارلیمنٹ بادشاہ، مجلس ملی (قومی اسمبلی) اور مجلسِ اعیان (سینیٹ) پر مشتمل ہوگی۔
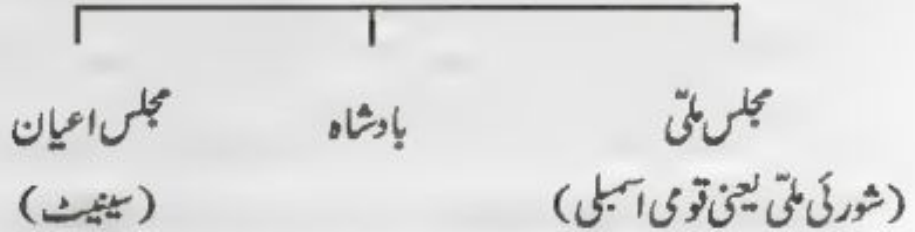
دستور میں یہ بھی کہا گیا کہ شورائی ملی کے اراکین انتخابات کے ذریعے منتخب کیے جائیں گے۔ جبکہ مجلسِ اعیان کے تمام ممبران کی نامزدگی بادشاہ کرے گا۔ دستور میں یہ بھی طے کیا گیا کہ شریعت پر مبنی عدالتی نظام قائم کیا جائے گا۔ اس طرح نادرخان کے زمانے میں افغانستان میں جمہوری طرز کی حکومت کا آغاز ہوا۔

نادرخان نے عساکر کو بھی منظم کیا۔ تعلیم کی طرف اس کی خاصی توجہ تھی طلبہ میں علم کا ذوق بڑھانے اور قوم کو تعلیم کی اہمیت سمجھانے کے لیے نادرشاہ خود اسناد اور انعامات تقسیم کیا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک تقریب میں جو ''قصرِ دلکشا'' میں منعقد ہوئی تھی، عبدالخالق [۹] نامی ایک طالب علم نے اس وقت نادرشاہ کو گولی ماری جب وہ طلبہ کی پہلی قطار کے ایک ایک فرد سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اس طرح ۸؍نومبر ۱۹۳۳ء کو نادرخان زندگی کی بازی ہار گیا۔

اس ناگہانی قتل سے علامہ اقبال کو بے انتہا صدمہ ہوا۔ ۱۵؍نومبر ۱۹۳۳ء کو نادرشاہ کے جانشین محمد ظاہرشاہ اور وزیراعظم کے نام تعزیتی پیغامات ارسال کیے۔

محمد ظاہرشاہ کے نام لکھا:

''اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے قتل کی خبر سن کر مجھے ذاتی حیثیت سے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ اعلیٰ حضرت شہید کی خدمت میں گذشتہ کئی سال سے مجھے نیاز حاصل تھا اور میں ان کی شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ شہید کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کے لیے اس جلیل القدر شہید کی یاد ہمیشہ موجب راہنمائی ہو اور اللہ تعالیٰ آپ کو افغانستان کی خدمت کے لیے مدت دراز تک زندہ رکھے۔

ملت افغانی نے اتفاق رائے سے آپ کے حضور میں اطاعت کر کے جس دانشمندی اور جذبات تشکر کا ثبوت دیا ہے، اس کی تحسین میں ساری دنیا ہم زبان وہم آہنگ رہے گی۔'' ۷

وزیر اعظم افغانستان کے نام حسب ذیل پیغام بھیجا:

''میں نے اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے غدارانہ قتل کی خبر سے نہایت شدید رنج و اندوہ محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت شہید کی روح کو خلعت مغفرت عطا فرمائے۔ آپ نجات دہندہ افغانستان اور زمانہ حاضر کے جلیل ترین حکمرانوں سے تھے اور آپ کے انتقال کا نقصان تمام دنیائے اسلام میں محسوس کیا جائے گا۔ اعلیٰ حضرت شہید کی ذاتی شجاعت، ذاتی تقویٰ اور اسلام اور افغانستان سے محبت آئندہ نسلوں کے لیے بہت بڑی ہمت افزائی اور تحریک عمل کا باعث ہوگی.... اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس صدمے میں صبر وثبات کی توفیق عطا فرمائے۔ ۸

جیسا کہ لکھا گیا کہ نادر شاہ نے اپنے دَورِ حکومت میں تعلیمی اصلاحات کی طرف خاصی توجہ دی اور اس سلسلے میں اکتوبر ۱۹۳۳ء میں مشورے کی خاطر ہندوستان سے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو افغانستان کی دعوت دی۔ اس سفر کی دلچسپ روداد سید سلیمان ندوی نے **سیرِ افغانستان** کے نام سے لکھی ہے اور علامہ اقبال نے اپنی مثنوی **مسافر** میں افغانستان کی چند روزہ سیاحت سپرد قلم کی۔ جس پر تفصیل سے اگلے باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

علامہ اقبال نے نادر شاہ کے بارے میں جن اشعار میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ بالِ جبریل میں ''نادر شاہ افغان'' کے عنوان سے محفوظ ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

حضورِ حق سے چلا لے کے لولوئے لالا
وہ ابر جس سے رگِ گل ہے مثلِ تارِ نفس
بہشت راہ میں دیکھا تو ہوگیا بے تاب
عجب مقام ہے، جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزۂ نورس
سرشک دیدۂ نادر بہ داغِ لالہ فشاں
چناں کہ آتش او را دگر فرو نہ نشاں

(بالِ جبریل: نادر شاہ)

علامہ اقبال کی مجلسوں میں جب بھی نادر شاہ کا ذکر آتا تو اقبال انہیں بڑے اچھے الفاظ میں یاد کرتے۔ ۱۹۳۴ء میں جمال الدین احمد اور محمد عبدالعزیز نے افغانستان پر بزبانِ انگریزی ایک کتاب لکھی، کتاب کے مقدمے میں اقبال لکھتے ہیں:

''مجھ سے کہا گیا ہے کہ افغانستان پر اس نفیس کتاب کے پیش گفتار کے طور پر چند سطریں لکھ دوں۔ مجھے اس فرمائش کے پورا کرنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ میں افغانوں کا ایک جفاکش اور سخت کوش جاندار قوم کی حیثیت سے احترام کرتا ہوں بلکہ اس لیے بھی کہ مرحوم نادر شاہ کو شخصی طور سے جاننے کی عزت بھی مجھے حاصل ہے۔ وہ مجاہد سیاست دان، جس کی شخصیت نے اُس کی قوم میں ایک نئی جان ڈال دی اور جدید دنیا کو سمجھنے کے لیے نئی نظر بخشی۔''[9]

حوالہ جات

۱۔ فقیر سید وحید الدین، روزگارِ فقیر، حصہ اوّل، ص ۸۹ (کراچی ۱۹۵۰ء)

۲۔ ہاشمی، رفیع الدین، علامہ اقبال: شخصیت اور فن، ص ۱۹۹ (اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء)

۳۔ ایضاً

۴۔ محمد رفیق افضل، گفتارِ اقبال، ص ۹۸ (ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۹ء)

۵۔ ایضاً، ص ۹۹۔۱۰۰

۶۔ عبدالخالق نامی طالب علم کا تعلق لوغر چرخی خاندان سے تھا۔ چرخی خاندان امان اللہ کا بہت حامی تھا اور نادر شاہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس خاندان نے امان اللہ کے اقتدار کے لیے سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ نادر شاہ نے اس خاندان کے سربراہ غلام نبی کو ۱۹۳۲ء میں سزائے موت دی تھی۔ اس کالے پالک بیٹا عبدالخالق تھا، جس نے ایک سال بعد ہی نادر شاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۷۔ محمد رفیق افضل، گفتارِ اقبال، ص ۱۸۰۔۱۸۱

۸۔ ایضاً

۹۔ دائرہ معارف اقبال، ج ۳، ص ۵۵۹ (پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور ۲۰۱۴ء)

باب ہفتم

ظاہر شاہ کو اقبال کی نصیحتیں

نادر خان فرمانروائے افغانستان ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو مقتول ہوئے۔ان کے بعد ان کا بیٹا ظاہر شاہ تخت نشین ہوا۔اس کی عمر اس وقت ۲۹ سال تھی۔اس نے ابتدائی تعلیم کابل میں حاصل کی تھی لیکن اعلیٰ تعلیم فرانس میں Lysee Jenson de Saily Pasteron میں حاصل کی۔دس سال کے بعد اکتوبر ۱۹۳۰ء کو واپس افغانستان آ گیا۔ظاہر شاہ کی واپسی بھی براستہ بمبئی ہوئی۔ہندوستان میں موجود افغان قونصل خانے نے جہاں اخبارات کو اطلاع جاری کی وہیں علامہ اقبال کو بذریعہ تار مطلع کیا کہ ظاہر شاہ ۸ر اکتوبر کو فرنٹیئر میل میں بمبئی سے روانہ ہوں گے۔شدت گرما کے باعث سیدھے پشاور تشریف لے جائیں گے اور ۹ر اکتوبر کو شام کے وقت لاہور میں نزول اجلال فرمائیں گے۔لہٰذا پروگرام کے مطابق ظاہر شاہ لاہور پہنچے تو مسلمانوں کے ہجوم نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کیا،عمائدین شہر کے ہمراہ علامہ اقبال بھی ظاہر شاہ کی پذیرائی کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔[1] علامہ اقبال کی یہ ظاہر شاہ سے پہلی ملاقات تھی۔

کابل میں، Infantry Officer School نصاب مکمل کیا۔بعد میں اسسٹنٹ وار منسٹر اور وزیر تعلیم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔نظام حکومت سنبھالتے وقت ظاہر شاہ کو زیادہ تجربہ نہ تھا۔یورپ میں قیام کے دوران مغربی زندگی سے آشنا تھا اور اپنے لوگوں کے طور اطوار کو نہیں جانتا تھا۔باہوش، تعلیم یافتہ اور با اخلاق تھا۔وہ تخت حکومت پر بیٹھا لیکن اصل

اختیار ہاشم خان اور وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنے بھتیجوں داؤد اور نعیم کو حکومت میں اشتراک کے لیے کوشاں تھا۔[۲]

۱۹۳۵ء میں علامہ اقبال کی اہلیہ سردار بیگم کی وفات (۲۳/مئی ۱۹۳۵ء) پر ظاہر شاہ نے تعزیت کا پیغام بھیجا اسی طرح خود علامہ اقبال کی وفات پر ظاہر شاہ نے یہ پیغام بھیجا:

"ہندوستان کے مایہ ناز فرزند حکیم مشرق علامہ اقبال کی وفات حسرت آیات کی اطلاع اعلیٰ حضرت کو پہنچائی گئی۔اعلیٰ حضرت نے اس خبر کو سن کر بے حد تألم و تأسف کا اظہار کیا۔"[۳]

جب علامہ اقبال کے مقبرے کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو سردار صلاح الدین سلجوقی نے جو ہندوستان میں حکومت افغانستان کے سفیر تھے، مزار کی تعمیر کے سلسلے میں ظاہر شاہ حکومت سے رابطہ کیا، ان کی اس دلچسپی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت افغانستان نے تعویذ اور لوحِ مزار کی پیش کش اپنی طرف سے کی۔افغانستان میں یہ تعویذ اور کتبہ دنیا کے انتہائی قیمتی پتھر (Lapis Lazuli) سے تیار کیا گیا یہ پتھر افغانستان اور وسط ایشیا کے علاوہ کہیں دستیاب نہیں تھا۔[۴]

علامہ اقبال کی سیاحتِ افغانستان کے دوران ظاہر شاہ سے بظاہر کوئی ملاقات نہیں ہوئی لیکن انہوں نے احمد شاہ ابدالی کے مزار پر حاضری دی اور اسی روحانی عالم میں ابدالی نے اقبال سے کہا کہ وہ نادر شاہ کے بیٹے ظاہر شاہ کو اپنے افکار بیان کریں:

اے ترا حق داد جان ناشکیب
تو ز سر ملک و دیں داری نصیب
فاش گو با پور نادر فاش گوے
باطن خود را بہ ظاہر فاش گوے

چنانچہ علامہ اقبال نے ظاہر شاہ کو خطاب کر کے مندرجہ ذیل اہم نصیحتیں فرمائیں:

"تم اپنے والد کی طرح اہل ہنر افراد کی عزت کرو اور صاحب نظر اشخاص کو عزیز رکھو۔اپنے والد مرحوم کی طرح ہوشیار ہو کر رہو۔زندگی میں سخت

کوشی، حوصلہ مندی اور کراری اختیار کرو۔ تمہیں معلوم ہے کراری کے کیا معنی ہیں؟ یہ حضرت علیؓ کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ اس دنیائے فانی میں قوموں کی زندگی کراری سے ہی ممکن ہے۔ عثمانی ترکوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالو کہ وہ اہل مغرب کا فریب کھا کر کس طرح خستہ حال ہو رہے ہیں۔ جب تک ان میں کراری اور جہادی روح زندہ تھی دنیا میں ان کے علم بلند تھے۔ ہندوستان کے مسلمان میدان سے کیوں بھاگ گئے اور حکومت کھو بیٹھے، صرف اس لیے کہ ان میں خوئے کراری نہ رہی۔ ان کا وجود سرد اور بے حس ہو گیا، یہاں تک کہ میری شعلہ بیانی بھی ان پر اثر نہ کر سکی۔

تمہاری سرشت میں نادر خان والا ذکر وفکر موجود ہے اور تم جلال و جمال کی صفات کے حامل ہو۔

دن رات محنت کر کے ایک نیا زمانہ معرض وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ابھی سینکڑوں جہان باقی ہیں۔ اس کی آیات سے قوت حاصل کرو اور پھر وہ قوت افغانوں کو عطا کرو اور اس طرح ان کے زمانے کو صبح نوروز بنا دو۔ ملت افغان پہاڑوں اور وادیوں میں گم ہے۔ جب کہ میں نے اس کی پیشانی میں کچھ اور ہی چیز دیکھی ہے۔ چوں کہ میرے دل میں اس کے لیے خاص کرب اور درد تھا اس لیے حق تعالیٰ نے مجھے اس کی تقدیر سے آگاہ فرمایا ہے۔ میں نے اس کے نظامِ حیات کو دقت نظر سے دیکھا ہے۔ جو حقائق ابھی مخفی ہیں میں نے ان کو بھی علانیہ دیکھا ہے۔

اس ملت کا مجاہد اللہ ھو کے نعرے سے زندہ ہے۔ اس دنیا کے مشرق و مغرب سب اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔ جو شخص غیر اللہ کے ساتھ دوستی نہیں کرتا وہ شیشے سے پتھر کو توڑ سکتا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں سما سکتا اس کے دریائے وجود پر بند نہ باندھو۔ اس کے عملیات کو محدود نہ کرو۔ جب وہ اپنے چہرے سے نقاب

اٹھائے گا تو دنیا میں ایک قیامت ہو گی۔

ہمارا سرمایۂ حیات کتاب اللہ اور حکمت ہے۔ انہی دو قوتوں سے ہمارا ملی اعتبار ہے۔ کتاب اللہ ہمارے عالمِ ذوق وشوق کی دولت ہے اور حکمت ہماری دنیاوی زندگی کا سرمایہ ہے۔ دین و دنیا کی یہ دونوں قوتیں اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں۔ اوّل الذکر مسلمانوں کے لیے باعث جمال ہے اور آخر الذکر مسلمانوں کے لیے باعث جلال ہے۔

حکمت اشیا یعنی سائنس مغرب کی پیدا کردہ نہیں، یہ تو قوت ایجاد کا نتیجہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی ایجاد ہے لیکن ہم نے اس موتی کو کھو دیا۔ جب عربوں نے یورپ میں اپنا نظام قائم کیا تو انہوں نے علوم وفنون کے نئے مراکز قائم کیے۔ بیج تو صحرا نشینوں نے بویا لیکن اس کا ثمر اہل یورپ نے اٹھا لیا۔ علوم وفنون کی یہ پری ہمارے اسلاف کے شیشے سے نکلی ہے اسے پھر پکڑو کیونکہ یہ ہمارے ہی کوہ قاف کی پری ہے۔ البتہ بے دین تہذیب سے گریز کرو کیونکہ وہ اہل حق کی دشمن ہے۔ اس فتنہ پرداز تہذیب سے سیکڑوں فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ حرم پاک میں دوبارا لات عزیٰ کے بت لا رہی ہے۔ اس کے طلسم سے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور روح حقیقت سے دور ہو کر مر جاتی ہے۔ دل سے اضطراب کو سلب کر لیتی ہے اور روح کو بدن سے نکال لیتی ہے۔ روحانیت کو ختم کر دیتی ہے۔ بے دین تہذیب بڑی ماہر راہزن ہے، یہ انسانی فطرت کے حسن کو تباہ کر دیتی ہے۔

خدا تمہیں حضور قلب کی دولت عطا فرمائے۔ یاد رکھو کہ زندگی اور موت عزت ہی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ روح صرف حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق سے زندہ اور پابند ہو سکتی ہے۔ ہمیشہ پائندہ رہنے والی ذات صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ تعلق قائم کرنا اصل زندگی حاصل کرنا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے قطع تعلق کر کے زندگی بسر کرتا ہے وہ مردہ ہے۔

اگر تو زندگی اور استحکام چاہتا ہے تو قرآن سے حاصل کر۔ میں نے اس میں آب وحیات پایا ہے وہ ہمیں پیغام دیتا ہے کہ خوف نہ کھاؤ۔ وہ ہمیں مقام لاتخف پر فائز کر دیتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں اور امیروں کی قوت بھی لا الہ ہے اور مرد فقیر کی ہیبت بھی لا الہ سے ہے۔ جب تک لا الہ الا اللہ کی شمشیر ہمارے ہاتھ میں تھی ہم نے باطل قوتوں کے نام ونشان مٹا دیے تھے۔

مشرق میری آتش نوائی سے روشن ہے۔ مبارک ہے وہ شخص جو میرے زمانے میں ہے۔ میرا سوز وساز حاصل کر کیونکہ میرے بعد مجھ ایسا مرد فقیر پیدا نہیں ہوگا۔ میں نے حکمت قرآن کے موتی پروئے ہیں اور اخلاق الہیہ ''صبغتہ اللہ'' کی رمز کی شرح بیان کی ہے۔ میں نے مسلمانوں کو حیات نو عطا کی ہے۔ میرا عشق زندگی کی راہوں کو روشن کرنے والا ہے۔ عقل بھی میرے فیض سے روشنی حاصل کرتی ہے۔ میرے مے خانے سے ایک دو جام پیو تا کہ تم دنیا میں تیغ بے نیام بن کر جی سکو۔''[5]

۞۞۞

حوالہ جات

[1] فاروقی، محمد حمزہ، اقبال کا سیاسی سفر، ص۲۰۲ (بزم اقبال لاہور، ۱۹۹۲ء)

[2] Amin Saikal, *Modern Afghanistan*, London 2004, P.105.

[3] دائرہ معارف اقبال، ج۲، ص۷۰۶

[4] فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، ص۲۵۵ (مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور)

[5] دائرہ معارف اقبال، ج۲، ص۷۰۷۔۷۰۸

۞۞۞

باب ہشتم

سیاحت افغانستان اور مثنوی مسافر

علامہ اقبال نے اپنے پندرہ روزہ سفرِ افغانستان کی منظوم روداد لکھی جو مثنوی مسافر کہلاتی ہے۔ مثنوی نظم کی ایک قسم ہے جس میں کوئی مسلسل بات یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں ہر شعر کا قافیہ جدا ہوتا ہے لیکن ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کے منظوم کلام کا بیشتر اور اہم ترین حصہ مثنوی ہی کی صنف میں ہے۔ کوئی بھی عارف یا مفکر جو اپنی قلبی واردات اور مشاہدات کو جب مرتب شکل میں بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ مثنوی کی طرف رجوع کرتا ہے کیونکہ قصیدے، غزل یا رباعی وغیرہ میں منتشر موضوعات اور خیالات تو بیان ہوسکتے ہیں لیکن ایک منظم اور مسلسل موضوع کو بیان کرنے کے لیے مثنوی ناگزیر ہے۔ فردوسی نے ایرانِ قدیم کی تاریخ، تہذیب، تمدن اور مذہب وغیرہ کو بیان کرنے کا ارادہ کیا تو مثنوی کا انتخاب کیا۔ **شاھنامۂ فردوسی** رزمیہ مثنوی کی صورت میں ایک ادبی شاہکار ہے۔[1]

اسی طرح مولانا روم کی ''مثنوی معنوی'' کے ایک ایک شعر میں حکمت کے موتی پروئے گئے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے نظریات کو مرتب صورت میں مثنوی ہی میں پیش کیا ہے۔ اقبال کی مثنویوں میں ''اسرارِ خودی''، ''رموزِ بے خودی''، ''جاوید نامہ''، ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق''، ''مسافر'' اور ''بندگی نامہ'' شامل ہیں۔ اقبال اپنی مثنویات میں مولانا جلال الدین رومی سے بے حد متاثر ہیں اور اقبال نے رومی کی مثنوی معنوی کی معروف و مانوس

بحر (بحر رمل مسدس محذوف) کو اپنی مثنویوں میں اختیار کیا ہے۔ اقبال نے رومی کی مثنوی کی بحر کو اس لیے انتخاب کیا کہ وہ رومی کے فکر وفن سے نزدیک رہیں اور جہاں ضروری ہو وہاں رومی کے اشعار کو اپنے کلام میں تضمین کریں۔ جیسا کہ مثنوی مسافر میں بھی کیا گیا ہے۔

مثنوی مسافر علامہ اقبال کے سفرِ افغانستان کی دل آویز یادگار ہے۔ یہ مثنوی بھی بحر رمل میں ہے اور مولانا رومی ہی کے مکتبِ عرفان کی یاد دلاتی ہے۔ اس مختصر مثنوی میں دو تین جگہ خوبصورت غزلیں شامل ہیں۔ اقبال اس سفر میں بابر تیموری، حکیم سنائی، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے مزارات پر حاضر ہوئے اور اسلامی تاریخ کے درخشاں ابواب کو بیان کر کے مسلمانوں میں اسلاف کی روح پھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال نے افغانستان کا یہ سفر ۲۰ راکتوبر تا ۴ رنومبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر اختیار کیا تھا، اس سفر میں علامہ اقبال کے ساتھ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی بھی ہمراہ تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہے کہ نادر شاہ نے ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے متعدد شعبوں میں اصلاحات نافذ کیں۔ انہوں نے تعلیم کے شعبے پر خاص توجہ دی، وہ نصابِ تعلیم کو جدید اصولوں پر استوار کر کے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ کابل میں ایک یونی ورسٹی کے قیام کی آرزو بھی رکھتے تھے، اسی مقصد کی خاطر نادر شاہ نے ہندوستان سے مذکورہ وفد کو بلایا تھا۔

اس سفر میں ہندوستانی وفد نے کابل، غزنین اور قندھار کا سفر اختیار کیا۔ مثنوی مسافر میں اس سفر کی منظوم روداد بیان کی گئی ہے۔ مثنوی کے آغاز میں نادر شاہ کی توصیف و تحسین بیان کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں:

نادرؔ افغاں شہ درویش خو — رحمت حق بر روانِ پاک او
کارِ ملت محکم از تدبیر او — حافظ دین مبیں شمشیر او
چوں ابوذرؔ خودگداز اندر نماز — ضربتش ہنگام کیں خارا گداز
عہد صدیقؓ از جمالش تازہ شد — عہد فاروق از جلالش تازہ شد

از غمِ دیں در دلش چوں لالہ داغ	در شبِ خاور وجودِ او چراغ
در نگاہش ہستی ارباب ذوق	جوہر جانش سراپا جذب و شوق
خسروی شمشیر و درویشی نگہ	ہر دو گوہر از محیط لا الہٰ
فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است	ایں تجلی ہائے ذات مصطفیٰ است
ایں دو قوت از وجودِ مومن است	ایں قیام واں سجود مومن است
فقر سوز و درد و داغ و آرزو است	فقر را درخوں تپیدن آبرو است
فقر نادرؔ آخر اندر خوں تپید	آفریں بر فقر آں مرد شہید
اے صبا، اے رہ نوردِ تیز گام	در طوافِ مرقدش نرمک خرام
شاہ درخواب است پا آہستہ نہ	غنچہ را آہستہ تر بکشا گرہ

ترجمہ:

☆ افغانستان کا بادشاہ نادر شاہ ایک درویش صفت انسان ہے، اس کی پاک روح پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

☆ اس کی تدبیر سے امت مسلمہ کا معاملہ مستحکم ہوا ہے اس کی تلوار روشنِ دین یعنی اسلام کی محافظ ہے۔

☆ وہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح نماز میں خود کو پگھلا دینے والی یعنی پوری طرح محو ہو جانے والا اور باطل قوتوں سے جنگ کے وقت اس کا وار سخت پتھر کو بھی پگھلا دیتا یعنی بری طرح ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دَور خلافت اس کے جمال یعنی اس کے حسن تدبیر اور نوازشات سے، گویا پھر لوٹ آیا ہے جبکہ اس کے جلال یعنی ہیبت و دبدبہ نے ایک مرتبہ پھر حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت کی یاد تازہ کر دی ہے۔

☆ دین اسلام سے بے حد محبت کے باعث اس کے دل میں غم کا داغ اسی طرح ہے جس طرح لالہ کے پھول میں داغ ہوتا ہے۔ سرزمین مشرق کی رات میں اس کا

وجود گویا چراغ ہے (یعنی مشرق اس وقت غلامی کی جس تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے، نادر شاہ کا وجود اس کے لیے آزادی کے چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔)

☆ اس کی نگاہوں میں اہل ذوق کی سی مستی و بے خودی ہے اور اس کی روح کی اصل یعنی اس کی ذات پوری طرح جذب وشوق میں ڈوبی ہوئی ہے یعنی وہ عشق حقیقی کے جذبوں سے خوب سرشار ہے۔

☆ وہ ایک ایسا بادشاہ ہے جس کی تلوار بادشاہت اور جس کی نگاہ اس کی درویشی ہے۔ ان دونوں موتیوں کا تعلق کلمہ طیبہ (لا الہٰ الا اللہ) کے سمندر سے ہے۔ (مطلب یہ کہ وہ چونکہ کلمہ طیبہ کا حقیقی مظہر ہے اس لیے اس میں یہ دونوں صفتیں ہیں۔ اس کی تلوار باطل قوتوں پر اور نگاہ دلوں پر حکمرانی کر رہی ہے۔)

☆ فقر اور شاہی دونوں یکجا ہوں تو یہ حضور اکرمؐ کی خالص حالت قلبی کا پتا دیتی ہیں اور یہ حضورؐ کی ذات کے جلوے ہیں۔

☆ یہ دونوں مذکورہ قوتیں مومن ہی کے وجود سے ہیں۔ یہ یعنی شاہی مومن کا قیام ہے تو وہ یعنی فقر اس کا سجدہ ہے۔

☆ فقر نام ہے سوز و درد کا اور داغ و آرزو کا اور فقر کے لیے خون میں تڑپنا ہی آبرو کا باعث ہے یعنی عشق الٰہی میں سرشار ہونے کے باعث قلب وجگر کو خون کر لیتا ہے۔

☆ اسے اگر محبوب حقیقی کی خاطر اپنا خون بھی دینا پڑے تو اس کے لیے یہ امر بھی باعث آبرو ہوتا ہے۔

☆ نادر شاہ کا فقر آخر کار خون میں لوٹا تڑپا (اس کے قتل کی طرف اشارہ ہے) اس شہید مرد کے فقر پر آفرین ہے۔

☆ اے صبا! تو تیز چلنے والی مسافر ہے، جب تو اس (نادر شاہ) کے مرقد کے گرد چکر لگائے تو وہاں ذرا آہستہ چلنا۔

☆ نادر شاہ سویا ہوا ہے تو (بادصبا) ذرا پاؤں آہستہ سے رکھ اور کلی کو آہستہ سے

کھلا، تا کہ اس کی چنک کی آواز پیدا نہ ہو جو اس کے آرام میں خلل ڈالے۔

آگے کے اشعار میں نادر شاہ کی زبان سے علامہ اقبال کے کلام کی تحسین ہے اُس کے بعد علامہ اقبال سفر کے حالات اور مقامات کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرتے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں:

طے نمودم باغ و راغ و دشت و در — چوں صبا بگذشتم از کوہ و کمر
خیبر از مردانِ حق بیگانہ نیست — در دلِ او صد ہزار افسانہ ایست
جادہ کم دیدم ازو پیچیدہ تر — یا وہ گردد در خم و پیچش نظر
سبزہ در دامانِ کہسارش مجوے — از ضمیرش بر نیاید رنگ و بوے
سر زمینے کبک او شاہیں مزاج — آہوئے او گیرد از شیراں خراج
در فضایش جرہ بازاں تیز چنگ — لرزہ برتن از نہیب شاں پلنگ
لیکن از بے مرکزی آشفتہ روز — بے نظام و ناتمام و نیم سوز
فر بازاں نیست در پروازِ شاں — از تدرواں پست تر پروازِ شاں
آہ قومے بے تب و تاب حیات — روزگارش بے نصیب از واردات
آں یکے اندر سجود، ایں در قیام — کار و بارش چوں صلوٰت بے امام
ریز ریز از سنگ او مینائے او — آہ! از امروز بے فردائے او

ترجمہ:

☆ (اب سفر افغانستان کے حالات ہیں) چنانچہ میں دشت و درہ اور باغ اور سبزہ زاروں میں سے گذرا۔ صبا کی طرح میں نے پہاڑوں اور وادیوں کا راستہ طے کیا یعنی منزل کے شوق میں یہ راستہ آسانی سے طے کرلیا۔

☆ درۂ خیبر اللہ کے خاص بندوں سے خالی نہیں ہے۔ اس (درہ) کے دل میں ہزاروں افسانے ہیں۔ (مطلب یہ کہ اس علاقے نے تہذیب وثقافت اور سیاست وغیرہ

کے کئی ایک دور دیکھے ہیں جن کی کہانیاں اس کی تاریخ کا حصّہ ہیں، بالخصوص مردان حق کے مختلف کارنامے یہاں کی تاریخ کا بہت بڑا حصّہ ہیں۔)

☆ میں نے (آج تک) اس سے زیادہ دشوار گذار راستہ نہیں دیکھا۔ اس راستے کے پیچ وخم میں نظر الجھ کر رہ جاتی ہے۔

☆ اس کے پہاڑوں کے دامن میں سبزہ تلاش نہ کر اس کے ضمیر سے رنگ و بو باہر نہیں آتے یعنی پھل پھول نہیں اگتے جو رنگ اور خوشبو کا باعث بنیں۔

☆ وہ ایک ایسی سرزمین ہے جہاں کا کمزور پرندہ چکور بھی شاہین کی ٹکر کا ہے جبکہ وہاں کا ہرن شیروں سے باج وصول کر رہا ہے۔

☆ اس کی فضا میں تیز پنجوں والے ایسے نر باز اڑتے ہیں جن کے خوف سے چیتے کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ (یہ دلیر افغانیوں کے لیے استعارہ ہے)

☆ لیکن افسوس کہ ایسے دلیر قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے (یعنی ایک مرکز پر جمع نہ ہونے کے باعث) وہ پریشان حال ہیں۔ یہ لوگ نظم وضبط سے عاری، نامکمل اور نیم سوز ہیں۔ گویا ایک تو وہ منظم بھی نہیں ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ ترقی یافتہ بھی نہیں ہیں۔

☆ ان کی پرواز میں بازوں کی سی شان وشکوہ نہیں ہے بلکہ ان کی پرواز چکوروں / تیتروں سے بھی پست تر ہے۔ مطلب یہ کہ اگرچہ وہ بڑے دلیر اور بہادر ہیں، ان میں صلاحیتیں بھی ہیں، لیکن ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے اور یوں پسماندگی کا شکار ہو رہے ہیں۔

☆ افسوس ہے ایسی قوم پر جس میں زندگی کا جوش وجذبہ نہیں اور جس کی حالت و کیفیت واردات سے خالی ہے (یعنی یہ قوم جمود کا شکار اور عمل سے بیگانہ ہے، جس کی وجہ سے وہ جہالت میں ڈوبی ہوئی اور یوں ذلت کی زندگی پر قانع ہے۔)

☆ اس قوم کا کوئی فرد تو سجدے میں ہے اور کوئی قیام میں اس قوم کا معاملہ کچھ ایسا ہے جیسے امام کے بغیر نماز ہو۔ (اس استعارے کے حوالے سے یہ کہنا چاہا ہے کہ

افغان بے نظمی، مرکزیت سے بیگانگی اور نفاق و انتشار کا شکار ہیں۔)

☆ اس کے اپنے ہی پتھر سے اس کی صراحی چکنا چور ہے۔ افسوس کہ اس کا آج، آنے والے کل سے محروم ہے یعنی وہ لوگ باہمی لڑائی جھگڑوں میں پڑے رہتے ہیں۔ ان کی بے عملی اور جدوجہد سے دوری کے باعث ان کے شاندار مستقبل کی توقع نہیں اور یہ امر بہت ہی لائق افسوس ہے۔

اس تمہیدی حصے کے بعد ''خطاب بہ اقوام سرحد'' کا عنوان قائم کر کے سرحدی پٹھانوں کو ان کی اصل یاد دلاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے خیال میں افغان اور سرحد کے پٹھان ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ فرنگی حکومت کے تحت رہنے والے پٹھانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے ز خود پوشیدہ خودرا بازیاب — در مسلمانی حرام است ایں حجاب
رمز دین مصطفیٰ دانی کہ چیست — فاش دیدن خویش را شاہنشہی است
چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش — زندگی مرگ است بے دیدار خویش
آں مسلمانے کہ بیند خویش را — از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست — تیغ ''لا موجود الا اللہ'' اوست
درمکان و لا مکاں غوغائے او — نہ سپہر آوراہ در پہنائے او
تا دلش سرے ز اسرار خداست — حیف اگر از خویشتن نا آشناست
بندۂ حق وراث پیغمبراں — او نگنجد در جہانِ دیگراں
تا جہانے دیگرے پیدا کند — ایں جہان کہنہ را برہم زند
زندہ مرد از غیر حق دارو فراغ — از خودی اندر وجود او چراغ

ترجمہ:

☆ اے خود سے پوشیدہ انسان اپنے آپ کو پالے۔ مسلمانی میں یہ پردہ حرام ہے

(یعنی اپنی خودی کو پہچان، مغلوب کی بجائے غلبے والا بن۔ بحیثیت ایک مسلمان کے اپنی حقیقت سے باخبر ہو کر زندگی بسر کر۔ اپنی حقیقت سے پردہ اٹھا دے۔)

☆ کیا تجھے کچھ علم ہے کہ حضرت محمد مصطفیؐ کے دین کی حقیقت کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو آشکارا دیکھنا بادشاہی اور عظمت ہے۔ اپنی معرفت سے پوری طرح آگاہ ہونا عظمت وسربلندی کا باعث بنتا ہے۔

☆ دین کیا ہے؟ دین اپنے بھیدوں کو پالینے کا نام ہے، اگر اپنی ذات کو نہ پایا اور سمجھا جائے تو اس صورت میں زندگی بھی گویا موت ہے۔ اپنی معرفت وخودی سے بے خبر انسان محض ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔

☆ وہ مسلمان جو خود کو پالیتا ہے۔ وہ خود کو اس دنیا میں برگزیدہ بنالیتا ہے۔ گویا اس صورت میں اس کا شمار صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات میں ہوتا ہے۔

☆ ایسا مسلمان کائنات کے باطن سے آگاہ ہوتا ہے، اس کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ وہ "لا موجود الا اللہ" کی تلوار ہے (یعنی اس کا توحید پر کامل ایمان ہوتا ہے جس کے باعث وہ کائنات کی ہر ہر شے میں اس خالق مطلق کا عمل دخل سمجھتا ہے اور اس کی ذات اقدس سے وابستگی کی بنا پر وہ باطل قوتوں سے ٹکراتا اور مختلف اشیا کو اس ذات کے حسب منشا استعمال کرتا ہے۔)

☆ مکاں اور لامکاں یعنی اس دنیا اور آسمان سے آگے والی دنیا میں اس کا چرچا ہوتا ہے اور نو آسمان اس کی وسعت میں کھو جاتے ہیں (یعنی ایک حقیقی مومن چونکہ زمان ومکاں پر غالب آجاتا ہے اس لیے وہ ساری کائنات کا گویا محور بن جاتا ہے اور کائنات اس کی اطاعت گزار بن جاتی ہے۔)

☆ چونکہ اس مومن کا دل خدا کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے، اس لیے افسوس کی بات ہوگی اگر وہ اپنی ذات سے ناآشنا رہے یعنی اس کا دل تو خدا کی جلوہ گری کا آئینہ ہوتا ہے، پھر وہ بھلا اپنی معرفت سے کیوں بے خبر رہے۔

☆ بندۂ حق پیغمبروں کا وارث ہوتا ہے، وہ دوسروں کی دنیا میں نہیں سماتا۔ یعنی پیغمبروں کی تعلیمات پر کما حقہ عمل کے باعث اس کا اٹھنا بیٹھنا اور ہر طرح کی حرکت وسکون پیغمبروں ہی کے انداز کے مطابق ہوتی ہے، عام دنیا والوں کی طرح نہیں۔

☆ تا کہ وہ ایک نئی دنیا وجود میں لائے، وہ اس قدیم دنیا کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ (نئی دنیا سے مراد ایسی دنیا جو پیغمبروں کے انداز کی حامل ہوگی، لوگوں کی بنائی ہوئی دنیا کو درہم برہم کرنے کا مطلب ہے، وہ اسے ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا۔)

☆ خدا کا خاص بندہ، اللہ کے سوا باقی تمام کائنات سے خود کو دور رکھتا ہے، خودی سے اس کے وجود میں روشنی ہو جاتی ہے۔

افغانستان کی سرحد پر بسنے والے قبائل سے خطاب کرتے ہوئے علامہ مزید کہتے ہیں:

پائے او محکم برزم خیر و شر ‏— ذکر او شمیر و فکر او سپر
صحبتش از بانگے کہ برخیزد ز جاں ‏— نے ز نور آفتاب خاوراں
فطرت او بے جہات اندر جہات ‏— او حریم و در طوافش کائنات
ذرہ ے از گرد راہش آفتاب ‏— شاہد آمد بر عروج او کتاب
فطرت او را کشاد از ملت است ‏— چشم او روشن سواد از ملت است
اندکے گم شو بقرآن و خبر ‏— باز اے ناداں بخویش اندر نگر
درجہاں آوارہ ای، بیچارہ ای ‏— وحدتے گم کردہ ای، صد پارہ ای
بند غیر اللہ اندر پائے تست ‏— داغم از داغے کہ در سیمائے تست
میر خلیل! از مکر پنہانی بترس ‏— از ضیاع روح افغانی بترس
ز تش مردان حق می سوزمت ‏— نکتہ ے از پیر روم آموزمت

ترجمہ:

☆ نیکی اور بدی کی جنگ میں وہ بڑا ثابت قدم ہے۔ اس کا ورد وذکر اس کی تلوار ہے

جبکہ اس کی فکر اس کے لیے ڈھال کا کام دیتی ہے۔

☆ اس کی صبح کا آغاز اس اذان سے ہوتا ہے جو اس کی روح سے بلند ہوتی ہے۔ اس سورج کی روشنی سے اس کی صبح طلوع نہیں ہوتی جو مشرق سے طلوع ہوتی ہے۔

☆ اس کی فطرت جہات میں رہتے ہوئے جہات سے آزاد ہوتی ہے۔ اس کی کیفیت حریم کی سی ہے جس کے گرد کائنات طواف کرتی ہے۔

☆ اس کے راستے کے غبار کا ایک ذرہ بھی سورج کے برابر ہے۔ اس کے عروج پر کتاب گواہ ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ اس کا ہر عمل اور اس کی ہر بات دوسروں کے لیے نور ہدایت ہے جبکہ اس کی عظمت و سربلندی پر قرآن کریم گواہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ''اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب اور اعلیٰ رہو گے۔'')

☆ اس کی فطرت کو ملت ہی سے کشادگی حاصل ہے اور اس کی آنکھوں کی پتلی کی روشنی ملت ہی کی بنا پر ہے یعنی وہ ملت سے بیگانہ اور دور نہیں ہے اور ملت میں اس (مرد حق) کا وجود اس طرح ہے جس طرح آنکھ میں پتلی ہوتی ہے۔

☆ تو کچھ دیر کے لیے قرآن کریم اور احادیث میں محو ہو جا اور پھر اے نادان! اپنی ذات میں جھانک۔ قرآن کریم اور احادیث کے مطالعہ سے تجھ پر واضح ہو گا کہ ایک مرد حق کا کیا مقام و شان ہے۔

☆ تو (افغانی) دنیا میں کھو گیا ہے، عاجز اور بے بس ہو گیا ہے۔ تو نے وحدت کو کھو دیا ہے اور اس طرح سینکڑوں گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ مرکزیت اور ملی وحدت ختم کر کے کئی قبیلوں میں بٹ گیا ہے۔

☆ تیرے پاؤں میں غیر اللہ کی بیڑیاں ہیں۔ میں تو تیرے اس داغ سے زخمی ہو گیا ہوں جو ظاہر عبادت سے تیری پیشانی پر پڑ گیا ہے۔

☆ اے قوم کے سردار! چھپے ہوئے مکر سے ڈر، افغانی روح کے ضائع ہونے سے ڈر۔ (یعنی دشمن اس کوشش میں ہے کہ وہ اپنے مکر و فریب سے افغانی قبیلوں کو

ایک دوسرے سے دور رکھ کران کی وحدت کو ختم کردے تو (سردار) دشمن کے اس پوشیدہ مکروفریب سے ہوشیار رہ۔)

☆ میں تجھے مردانِ حق کی آگ سے جلاتا ہوں، میں تجھے پیرروم کی گہری رمز کی بات سکھاتا ہوں یعنی میں تم میں زندگی کا سوز اور عمل کا جذبہ دولولہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد "مسافر واردمی شود بہ شہر کابل وحاضرمی شود بحضوراعلیٰ حضرت شہید" [۲] کے عنوان سے کابل شہر کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔اس عنوان کے تحت علامہ اقبال نے کابل کے موسم اوراس کی فضا کی تعریف کی ہے،اس کے بعد نادرہ شاہ سے ملاقات اوراس کی دوراندیشی، ژرف نگاہی، خوش کلامی، سادہ لباسی، سخت کوشی، نرم خوئی، گرمجوشی، صدق و اخلاص، پاکیزگی، فقروشاہی اور حکمت ودانائی جیسی صفات کو بیان کیا ہے۔بادشاہ کے محل "قصرِ دلکشا" کی تعریف اور وہاں نادرشاہ کی اقتدا میں عصر کی نماز کی ادائیگی وغیرہ کا بیان ہے۔

شہر کابل! خطۂ جنت نظیر — آب حیواں از رگ تاکش بگیر
چشم صائب از سوادش سرمہ چیں — روشن و پائندہ باد آں سرزمین
در ظلام شب سمن زارش نگر — بربساط سبزہ می غلطد سحر
آں دیار خوش سواد، آں پاک بوم — بادِ او خوشتر ز بادِ شام و روم
آب او برّا و خاکش تابناک — زندہ از موج نسیمش مردہ خاک
ناید اندر حرف و صوت اسرار او — آفتاباں خفتہ درکہسار او
ساکنانش سیر چشم و خوش گہر — مثل تیغ از جوہر خود بے خبر
قصر سلطانی کہ نامش دلکشاست — زائراں را گرد راہش کیمیاست

ترجمہ:

☆ کابل کا شہر جنت کا سا خوبصورت خطہ ہے۔اس کی انگور کی بیل سے تو آبِ حیات حاصل کر۔

☆ صائب ؒ کی آنکھیں اس شہر کی سیاہی سے سرمہ حاصل کرنے والی ہے۔ خدا کرے وہ سرزمین روشن رہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے۔

☆ رات کی تاریکی میں اس کے چنبیلی کے سفید باغ تختے دیکھ، یوں لگتا ہے جیسے سبزے کی چٹائی سے صبح لپٹ رہی ہے۔

☆ وہ ایک اچھے ماحول والا شہر اور صاف ستھری سرزمین ہے۔ اس کی ہوا شام اور روم کی ہوا سے کہیں اچھی ہے۔

☆ اس کا پانی بہت شفاف اور اس کی خاک چمکنے والی ہے۔ اس کی صبح کی ہوا کی لہر سے مردہ خاک بھی زندہ ہو جاتی ہے۔

☆ اس کے بھید نہ تو الفاظ میں سما سکتے ہیں اور نہ آواز میں۔ اس کے پہاڑوں میں سورج سوئے ہوئے ہیں۔ یعنی یہاں مختلف قسم کی بڑی بڑی شخصیات دفن ہیں۔

☆ اس کے باشندے سیر چشم اور اچھی نسل والے ہیں۔ وہ تلوار کی طرح اپنی صلاحیتوں سے بے خبر ہیں یعنی جس طرح تلوار کی تیزی کا پتا کسی پر اس کے چلنے سے ہوتا ہے اسی طرح ان لوگوں کو اپنی اہلیتوں صلاحیتوں کا اس وقت پتا چلے گا جب وہ ان سے کام لیں گے۔

☆ اس کے شاہی محل کا نام "دل کشا" ہے، جس کے راستے کی گرد دیکھنے والوں کے لیے کیمیا کا اثر رکھتی ہے یعنی اس میں مومنانہ صفات کا حامل بادشاہ رہتا ہے۔

شاہ را دیدم در آں کاخ بلند	پیش سلطانے فقیرے دردمند
خلق او اقلیم دل ہا را کشود	رسم و آئین ملوک آنجا نبود
من حضور آں شہ والا گہر	بے نوا مردے بدربار عمرؓ
جانم از سوز کلامش در گداز	دست او بوسیدم از راہِ نیاز
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش	سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار	دین و دولت از و جودش استوار

خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر	از مقام فقر و شاہی باخبر
در نگاہش روزگار شرق و غرب	حکمت او راز دار شرق و غرب
شہر یارے چوں حکیماں نکتہ داں	راز دانِ مد و جزر امتاں
پردہ ہا از طلعت معنی کشود	نکتہ ہائے ملک و دیں را وانمود

ترجمہ:

☆ میں نے اس عالی شان محل میں بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات کچھ اس قسم کی تھی جیسے ایک سلطان اور ایک دردمند فقیر کی ملاقات ہو۔

☆ اس کا حسن خلق دلوں کی سلطنتوں کو فتح کرنے والا تھا۔ وہاں بادشاہوں والے طور طریقے نہ تھے۔

☆ میں اس عالی نسب بادشاہ کے حضور ایسے تھا جیسے کوئی مفلس کنگال حضرت عمر فاروقؓ کے دربار میں ہو۔

☆ میری جان اس کے سوز کلام سے پگھل رہی تھی۔ میں نے عقیدت کے طور پر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

☆ وہ ایک خوش گفتار سادہ لباس پہننے والا، جفاکش، نرم طبع اور تپاک سے ملنے والا بادشاہ تھا۔

☆ اس کی نگاہوں سے اس کا صدق و اخلاص ظاہر تھا۔ دین اور حکومت کو اس کے وجود سے استحکام ملا۔

☆ وہ تھا تو مٹی کا بنا ہوا مگر فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ فطرت تھا۔ وہ فقر اور سلطنت کے مقام و مرتبہ سے آگاہ تھا۔

☆ اس کی نگاہوں میں مشرق اور مغرب کا زمانہ تھا یعنی وہ زمانے کے حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس کی حکمت / دانائی مشرق اور مغرب کی رازدار تھی۔

☆ وہ ایک ایسا بادشاہ تھا جو اہل حکمت و خرد کی مانند نکتہ داں تھا اور قوموں کے عروج و

زوال کے اسباب پر وہ جو بات سے پوری طرح باخبر تھا۔

☆ اس نے معنی کے چہرے پر سے پردے ہٹادیے اور ملک اور دین کے نکتے دکھا دیے یعنی اس نے معاملات کی حقیقت ظاہر کی۔

گفت ''از آں آتش کہ داری در بدن — من ترا دانم عزیز خویشتن
ہر کہ او را از محبت رنگ و بوست — درنگاہم ہاشم و محمود اوست''
در حضور آں مسلمان کریم — ہدیہ آوردم ز قرآن عظیم
گفتم ''ایں سرمایہ اہل حق است — در ضمیر او حیات مطلق است
اندرو ہر ابتدا را انتہاست — حیدرؓ از نیروے او خیبر کشاست''
نشہ حرفم بخون او دوید — دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت ''نادر در جہاں بیچارہ بود — از غم دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر — از غمان بے حسابم بے خبر
نالہ ہا بانگ ہزار آمیختم — اشک با جوئے بہار آمیختم
غیر قرآں غم گسار من نہ بود — قوتش ہر باب را بر من کشود''

ترجمہ:

☆ (نادر شاہ) نے کہا کہ جو آگ (آتشِ عشق) تیرے بدن میں ہے، اس کی بنا پر میں تجھے اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔

☆ جس کسی میں بھی محبت کا رنگ و بو ہے، وہ میری نگاہ میں ہاشم اور محمود ہے۔

☆ (نادر شاہ جب اپنی بات ختم کر چکا تو) میں نے اس نیک مزاج و مہربان مسلمان (بادشاہ) کو قرآن عظیم کا تحفہ پیش کیا۔

☆ میں نے (تحفہ پیش کرتے ہوئے) کہا کہ قرآن کریم اہل حق کا سرمایہ ہے اور اس میں مکمل ضابطہ حیات ہے جس پر عمل سے زندگی کو بقا ملتی ہے۔

☆ اس (عظیم کتاب) میں ہر چیز کی ابتدا اور انتہا موجود ہے۔اسی کی قوت کے طفیل

حضرت علیؓ حیدر کرار فاتح خیبر بنے۔

☆ میری ان باتوں کا نشہ نادر شاہ کے خون میں دوڑ گیا یعنی وہ ان سے بے حد متاثر ہوا اور اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپکنے لگے۔

☆ اس (نادر) نے کہا کہ "نادر دنیا میں بیچارہ تھا۔ وہ (خود نادر) دین اور وطن کے غم میں بے قرار ہی رہا۔

☆ میرے وطن کے پہاڑ اور جنگل میری بے قراری سے بے خبر تھے۔ انہیں میرے بے حساب غموں کی خبر نہ تھی۔

☆ میں نے وہاں بلبل کی چہچہاہٹ کے ساتھ اپنا نالہ وفریاد ملایا اور میں نے اپنے آنسو بہار کی ندی میں ملا دیے۔

☆ وہاں پر قرآن کریم کے سوا اور کوئی میرا ہمدرد و غمگسار نہ تھا۔ اس (قرآن) کی قوت نے مجھ پر ہر دروازہ کھول دیا۔

علامہ اقبال مزید کہتے ہیں:

گفتگوئے خسرو والا نژاد — باز با من جذبۂ سرشار داد

وقت عصر آمد صدائے الصلوات — آں کہ مومن را کند پاک از جہات

انتہائے عاشقاں سوز و گداز — کردم اندر اقتدائے او نماز

رازہائے آں قیام و آں سجود — جز بزم محرماں نتواں کشود

ترجمہ:

☆ اس عالی نسب بادشاہ کی گفتگو نے ایک مرتبہ پھر مجھے بے خود بنا دینے والا جذبہ عطا کیا۔ مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔

☆ عصر کے وقت نماز کے بلاوے یعنی اذان کی آواز بلند ہوئی، وہ نماز جو مومن اور سچے مسلمان کو حدود سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

☆ عاشقوں کی انتہا سوز و گداز ہے (اس موقع پر بادشاہ نے) امامت کی اور میں نے اس کے پیچھے نماز پڑھی۔

☆ اس نماز کے قیام اور سجدے کے راز سوائے اپنے (ہم مزاج) واقف حال احباب کی محفل کے کہیں اور ظاہر نہیں کیے جا سکتے۔

کابل کی ان مصروفیات کے بعد علامہ اقبال شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر (م۱۵۲۹ء) کے مزار پر گئے۔ بابر فرغانہ کا والی تھا اور فتوحات کرتے کرتے دلی تک جا پہنچا۔ آگرے میں وفات پائی اور اپنی وصیت کے مطابق کابل میں دفن ہوا۔ ''بر مزار شہنشاہ بابر خلد آشیانی'' کے عنوان کے تحت علامہ، بابر کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بیا کہ ساز فرہنگ از نوا بر افتاد است — درون پردۂ او نغمہ نیست فریاد است
زمانہ کہنہ بتاں راہزار بار آراست — من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است
درفش ملت عثمانیاں دوبارہ بلند — چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است
خوشا نصیب کہ خاک تو آرمید ایں جا — کہ ایں زمیں ز طلسم فرنگ آزاد است
ہزار مرتبہ کابل نکوتر از دلی است — ''کہ آں عجوزہ عروس ہزار داماد است''
درونِ دیدہ نگہ دارم اشک خونیں را — کہ من فقیرم و ایں دولت خداداد است
اگرچہ پیر حرم وردِ ''لا الہٰ'' دارد — کجا نگاہ کہ برندہ تر ز پولاد است

ترجمہ:

☆ تو (بابر) آ کہ انگریز کے ساز کی آواز بے سری ہو گئی ہے۔ اس کے سر تال میں نغمہ نہیں بلکہ فریاد ہے۔

☆ زمانے نے ہزاروں مرتبہ پرانے بتوں کو آراستہ کیا لیکن میں حرم سے باہر نہیں نکلا یا میں نے حرم کو نہیں چھوڑا کہ اس کی بنیاد مضبوط ہے۔

☆ عثمانی ترکوں کا پرچم ایک مرتبہ پھر بلند ہو گیا ہے۔ تجھے (بابر) میں کیا بتاؤں کہ مغلوں

پر کیا بیتی ہے۔

☆ یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ تیری (بابر کی) خاک نے یہاں (افغانستان جیسے آزاد ملک میں) آرام کیا ہے۔

☆ کابل، دلی سے ہزار مرتبہ بہتر ہے کیونکہ یہ بڑھیا (دلی) ہزاروں شوہروں والی دلہن ہے۔

☆ میں نے اپنے خون کے آنسو اپنی آنکھوں ہی میں رکھے ہیں کیونکہ میں مفلس ہوں اور یہ دولت (آنسو) خدا کی عطا کردہ ہے۔

☆ اگرچہ پیر حرم لا الہٰ کا ورد کر رہا ہے لیکن اس میں ایسی نگاہ کہاں جو فولاد سے بھی زیادہ کاٹ دار ہو۔

نادر شاہ سے رخصت ہو کر اقبال اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہر غزنین پہنچے جو کابل سے اسی (۸۰) کلو میٹر دور ہے۔ وہاں اقبال کی دلچسپی کے دو مقامات تھے، ایک حکیم سنائی کا مزار اور دوسرا محمود غزنوی کا مزار۔ حکیم سنائی (م ۱۱۳۰ء یا ۱۱۴۰ء) فارسی کے عظیم شاعر اور مصلح تھے۔ مولانا روم اور عطار جیسے اکابر بھی سنائی سے متاثر تھے۔ اقبال مثنوی مسافر میں حکیم سنائی کے بارے میں کہتے ہیں:

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی — از نوائے او دل مرداں قوی
آں "حکیم غیب" آں صاحب مقام — "ترک جوش" رومیؔ از ذکرش تمام
من ز "پیدا" اوز "پنہاں" در سرور — ہر دو را سرمایہ از ذوق حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں کشود — فکر من تقدیر مومن وا نمود
ہر دو را از حکمت قرآں سبق — او ز حق گوید من از مردان حق
در فضائے مرقد او سوختم — تا متاع نالہ ے اندوختم

ترجمہ:

☆ جس (غزنی) کی خاک میں حکیم غزنوی (جیسی عظیم و بلند مرتبہ شخصیت) دفن ہے۔ (ایسی شخصیت) جس کے ترانے سے بہادروں کے دل اور بھی قوی ہوتے

ہیں۔

☆ وہ حکیم غیب اور وہ بلند مرتبہ شخصیت جس کے ذکر سے مولانا روم (رومیؒ) جیسی ہستی کی نیم پختگی اپنے کمال کو پہنچی۔

☆ میں ظاہر سے اور وہ (سنائی) سے سرور حاصل کرتا ہے، ہم دونوں کا سرمایہ ذوق حضور ہے۔

☆ اس نے ایمان کے چہرے سے نقاب اٹھادیا۔میری فکر نے مومن کی تقدیر کوظاہر کردیا۔گویا سنائی نے ایمان کی حقیقت واضح کی جبکہ میں نے اہل ایمان کی تقدیر کی وضاحت کی۔

☆ ہم دونوں نے قرآن کریم کی حکمت سے درس لیا ہے۔ہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ وہ تو حق کے بارے میں بات کرتا ہے جبکہ میری بات اہل حق سے متعلق ہوتی ہے۔

☆ میں اس کے مزار کے ماحول میں جل گیا، جب کہیں جا کر میں نے ایک نالہ کی دولت جمع کرلی یعنی اس ماحول میں غم وسوزِ عشق مجھ پر چھا گیا اور میں مجبور ہوگیا کہ سنائی سے (اس کی روح سے) بات کروں۔

مزارِ حکیم سنائی پر حاضری کے بعد یہ قافلہ سلطان محمود غزنوی (۹۷۰ء-۱۰۳۰ء) کے مزار پر گیا جو اپنے والد سبکتگین کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا تھا (۹۹۸ء) اپنے باپ کی طرح اسے بھی ہندو راجاوں کے حملوں کا خطرہ درپیش رہتا تھا جو اکثر غزنوی سلطنت میں لوٹ مار کرکے واپس چلے جاتے تھے۔[۲۲] چنانچہ ان خطرات کے پیشِ نظر اور ہندووں کے حملوں کے جواب میں محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور سومنات تک پہنچا۔علامہ اقبال، محمود غزنوی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔''بر مزار سلطان محمود علیہ الرحمۃ'' کے عنوان کے تحت کہتے ہیں:

خیزد از دل ہا بے اختیار — آہ! آں شہرے کہ ایں جا بود یار

آں دیار و کاخ و کو ویرانہ ایست — آں شکوہ و فال و فر افسانہ ایست

گنبدے! در طوفِ او چرخ بریں	تربت سلطان محمودؔ است ایں
آں کہ چوں کودک لب از کوثر بشست	گفت در گہوارہ نام او نخست
برق سوزاں تیغ بے زنہار او	دشت و در لرزندہ از یلغار او
زیر گردوں آیت اللہ رایتش	قدسیاں قرآں سرا بر تربتش

ترجمہ:

☆ دل سے بے اختیار نالے پیدا ہونے لگتے ہیں (اور وہ اس بات پر کہ) افسوس وہ شہر جو یہاں قدیم میں کبھی آباد تھا (کہاں گیا)۔

☆ وہ شہر، وہ محل اور گلی کوچے سب ویرانے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ وہ شان و شوکت اور شکوہ (جو کبھی محمود غزنوی کے دور میں تھی) اب افسانہ بن چکی ہے۔

☆ یہاں ایک گنبد ہے جس کے طواف میں بلند آسمان (مصروف) ہے۔ یہ سلطان محمود کی قبر ہے۔

☆ وہ محمود کہ جب کوئی بچہ اپنی ماں کے دودھ سے ہونٹ دھوتا یعنی بولنے کے قابل ہوتا تو وہ جھولے میں سب سے پہلے اس (محمود) کا نام لیتا۔

☆ اس (محمود) کی بے زنہار تلوار، جلا دینے والی بجلی کی مانند تھی اور اس کی یلغار سے دشت اور درے لرز اٹھتے تھے۔

☆ آسمان کے نیچے اس کا پرچم اللہ کی نشانی تھا۔ فرشتے اس کی قبر پر قرآن خوانی کرتے ہیں۔

عہدِ محمود میں غزنی دارالحکومت تھا، اس کے بازار اور گلیاں پُر رونق تھیں، جب اقبال اس شہر میں پہنچے تو اس کی ویرانی سے بہت دل گرفتہ ہوئے، وہ شہر جو اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، ایک کھنڈر بن چکا تھا، اس کی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتے ہوئے اقبال مثنوی میں متعدد اشعار کہتے ہیں۔

علامہ اقبال اور ان کے ساتھیوں کی اگلی منزل افغانستان کا قدیم شہر قندھار تھا۔ایک روایت کے مطابق وہاں نبی آخر الزماںؐ کا خرقۂ مبارک محفوظ ہے۔''قندھار و زیارتِ خرقۂ مبارک'' کے عنوان سے علامہ اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

قندھار آں کشور مینو سواد — اہل دل را خاک او خاک مراد
رنگ ہا، بوہا، ہواہا، آب ہا — آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا

ترجمہ:

☆ قندھار ایک ایسی سرزمین ہے جو بہشت کا سا ماحول رکھتی ہے۔اہل دل کے لیے اس کی خاک مراد کی خاک کا درجہ رکھتی ہے۔یہاں حضور اکرمؐ کا خرقہ مبارک محفوظ ہے جس نے اس کی زیارت کر لی اس کی مراد پوری ہوگئی۔

☆ یہ علاقہ رنگوں،خوشبوؤں،ہواؤں اور چشموں کا علاقہ ہے۔اس کے پانی پارہ کی طرح صاف وشفاف ہیں۔

آخر میں علامہ اقبال احمد شاہ بابا (م۱۷۷۲ء) کی قبر پر حاضری دیتے ہیں۔یہ تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کے نام سے معروف ہیں۔ان کے بارے میں تفصیلات گزشتہ ابواب میں گزر چکی ہے۔اس مردِ مجاہد نے افغانستان کو ایران کے تسلّط سے آزاد کرا کے ملتِ افغانیہ کی بنیاد رکھی۔اس زمانے میں ہندوستان میں مرہٹہ قوم زور پکڑ گئی تھی۔اس کے سدباب کے لیے احمد شاہ ابدالی،شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔علامہ اقبال ''برمزار حضرت احمد شاہ بابا علیہ الرحمۃ موسّس ملت افغانیہ'' (یعنی حضرت احمد شاہ بابا علیہ الرحمۃ کے مزار پر جو ملتِ افغانیہ کے بانی ہیں) کے عنوان سے کہتے ہیں:

تربت آں خسرو روشن ضمیر — از ضمیرش ملتے صورت پذیر
گنبد او را حرم داند سپہر — با فروغ از طواف او سیمائے مہر
مثل فاتح آں امیر صف شکن — سکہ ے زد ہم باقلیم سخن

ملتے را داد ذوق جستجو قدسیاں تسبیح خواں برخاک او
از دل ودست گہرریزے کہ داشت سلطنت ہابرد و بے پروا گذاشت
نکتہ سنج و عارف و شمشیر زن روحِ پاکش بامن آمد درسخن

ترجمہ:

☆ یہ اس روشن دل بادشاہ کی قبر ہے جس کے ضمیر سے ایک نئی ملت وجود پذیر ہوئی۔

☆ آسمان اس مزار کے گنبد کو حرم جانتا ہے (اسے بے حد احترام دیتا ہے) اس کے گرد چکر لگانے ہی سے خورشید کی پیشانی روشن ہے۔

☆ (فاتح قسطنطنیہ) سلطان محمد فاتح کی طرح اس جنگجو نے شاعری کی دنیا میں بھی اپنا لوہا منوایا۔

☆ اس نے ایک قوم (افغانیوں) میں طلب و جستجو کا ذوق پیدا کیا۔فرشتے اس کی قبر پر تسبیح پڑھتے ہیں۔

☆ اپنے دل اور اپنے موتی لٹانے والے ہاتھوں سے اس نے دل کی اور دوسری بہت سی سلطنتوں کو فتح کیا اور خود بے نیازی کی زندگی بسر کی۔

☆ وہ ایک نکتہ سنج، عارف اور دلیر جنگجو تھا،اس کی پاک روح مجھ سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگی۔

مثنوی کا اختتام ظاہر شاہ سے خطاب پر ہوتا ہے۔نادر شاہ کے قاتلانہ حملے میں شہادت کے بعد ظاہر شاہ تخت نشین ہوا۔شاہ کی شہادت کے بعد اب علامہ اقبال کی اُمیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔ظاہر شاہ کو پیغام دیتے ہوئے علامہ اقبال نصیحتیں کرتے ہیں اور یہ طولانی کلام ہے۔

سید سلیمان ندوی نے بھی اس سفر کی روداد سیرِ افغانستان کے نام سے قلم بند کی۔ ''مثنوی مسافر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کیا عجیب اتفاق ہے، آج ۱۷/۱۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو جب اس داستانِ سفر کی آخری

سفر سے میں نے فراغت پائی ہے، ڈاک کے قاصد نے ڈاکٹر سید محمد اقبال کی تالیف مسافر ہاتھ میں دی۔ یہ افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر موصوف کے شاعرانہ جذبات کا مجموعہ ہے، جو ابھی شائع ہوا ہے۔ فارسی زبان میں خیبر و سرحد کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبانِ حال سے سوال و جواب ہیں۔ مسافر کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام شاہ محمد ظاہر خاں سے توقعات سے ہوتا ہے۔"[۵]

یہ منظوم سفرنامۂ افغانستان عام سفرناموں کی طرز پر نہیں لکھا گیا، اس میں سفر کے حالات و واقعات کا بیان نہیں ہے بلکہ علامہ اصل مقصد محور پر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعی پیغام اس مثنوی میں بھی موجود ہے۔ مثنوی فکر و فن کا ایک شاہ کار ہے۔ اس میں تضمینات، تشبیہات و استعارت اور تلمیحات کا خوب صورت استعمال کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ مثنوی نقادوں کی کم توجہی کا شکار رہی لیکن یہ مثنوی اپنے فن، تکنیک یا تخیل کے لحاظ سے کسی طرح بھی باقی کلامِ اقبال سے کم تر نہیں۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں: "مسافر علامہ کے سفرِ افغانستان کے متعلق نقوش و تاثرات کا ایک بہت خوب صورت اور دل آویز مرقع ہے۔ اس مرقع کی ہر تصویر اپنی جگہ مکمل ہے اور ہر تصویر میں اس صدی کے نابغۂ روزگار کا لہو چمک رہا ہے۔"[۶]

حوالہ جات

1. دائرہ معارف اقبال، ج۳،ص ۳۶۸
2. علامہ اقبال نے نادر شاہ کو"شہید" اس لیے لکھا ہے، کیونکہ کچھ ہی عرصے بعد نادر شاہ ایک قاتلانہ حملے میں جاں بحق ہو گئے تھے اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔
3. صائب (م ۱۰۸۸ھ) نے کابل کا سفر بھی کیا تھا اور اس کی تعریف میں کہا تھا: ع

خوشا وقتے کہ چشم از سوادش سرمہ چیں گردو

علامہ اقبال نے اسی حوالے سے پہلا مصرع کہا ہے۔صائب کا دوسرا مصرع: ع

شوم چوں عاشقان و عارفاں از جاں گرفتارش

(دیکھیے :شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر از ڈاکٹر حمید یزدانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء)

4. دائرہ معارف اقبال، ج۳،ص ۳۷۵
5. سلیمان ندوی، سید، سیر افغانستان، ص ۱۴۶ (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء)
6. اکرام چغتائی، محمد، اقبال افغان اور افغانستان، ص ۲۶۰ (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء)

کتابیات

اقبال، محمد، پیام مشرق، (تسہیل و ترجمہ: احمد جاوید)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۲ء

اقبال، محمد، کلیات اقبال، اقبال اکادمی، لاہور ۱۹۹۴ء

اقبال، محمد، ارمغانِ حجاز، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۶ء

اکرام چغتائی، محمد، اقبال افغان اور افغانستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء

حمید یزدانی، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء

رفیق افضل، محمد، گفتارِ اقبال، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۹ء

سلیم اختر، علامہ اقبال۔ حیات فکر و فن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء

عبدالواحد معینی، سید، مقالات اقبال، شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۶۳ء

فاروقی، محمد حمزہ، اقبال کا سیاسی سفر، بزم اقبال، لاہور ۱۹۹۲ء

ندوی، سید سلیمان، سیر افغانستان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء

نگار سجاد ظہیر، اقبال اور مسلم اندلس، قرطاس، کراچی ۲۰۱۷ء

نگار سجاد ظہیر، مطالعہ تہذیب، طبع دوم، قرطاس، کراچی ۲۰۰۷ء

وحید الدین، فقیر، سید، روز گارِ فقیر، حصہ اوّل، کراچی ۱۹۵۰ء

ہاشمی، رفیع الدین، علامہ اقبال: مسائل و مباحث، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۲۰۱۲ء

ہاشمی، رفیع الدین، علامہ اقبال: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۸

—— اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ افغانستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۶۶ء

—— دائرہ معارف اقبال، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور ۲۰۰۶ء

1. Ludwig W. Adamee, *Historical Dictionary of Afghanistan*, London 1991.

2. Amin Saikal, *Modern Afghanistan*, London 2004